جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

مضامین عبدالماجد
دریابادی

مرتبہ

غلام دستگیر رشید ایم-اے

ناشر

ادارہ اشاعت اردو
عابد روڈ - حیدر آباد (دکن)

قیمت تین روپیہ چار آنے

پہلا ایڈیشن ایک ہزار

مارچ سنہ ۱۹۴۳ء

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشرز
حیدرآباد دکن

فہرست

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(ضربِ کلیم)

گلہائے رنگ رنگ

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ۱۸۹۳ء یقیناً ایک سالِ نیک تھا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ جیسے ادیب اور زبان دان نے اس عالم رنگ و بو میں پیکرِ ظہور پایا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت سے فراغت ہوئی تو لکھنؤ کے کیننگ کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ عام طور پر ہو یا نہ ہو لیکن بی۔اے کی ڈگری ان کے حق میں اسم بامسمّٰی تھی۔ عقل فلاطون میں واقعی بالغ نظر ثابت ہوئے، منطق، نفسیات اور فلسفہ کے بلند پایہ مضامین اور تصانیف سے اردو ادب میں اک جہان تازہ پیدا کر دیا۔ لکھنؤ کی فضا میں ذوقِ زبان اور حسنِ بیان کے جوہر اور بھی نکھر گئے۔ لیکن آپ کی نگاہِ بلند اور دلِ ہشیار نے علم فلاطون پر تکیہ اور قناعت کرنے سے انکار کیا "یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ" کا احساس اس "زود پشیماں" کو اہلِ دل کے حلقے میں کھینچ لایا۔ اور بحمداللہ خود صاحب دل اور صاحبِ نظر بن گئے ؎

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا

اپنے اسرارِ دل اور نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے آپ نے سچ اور صدق کو جاری کیا اردو صحافت کی تاریخ میں یہ جریدہ "ذکر و فکر" کا ایک نادر آئینہ ثابت ہوا۔

کارکنان اشاعت اُردو چاہتے ہیں کہ جواہر معانی یعنی مولٰنا عبدالماجد صاحب کے مضامین مختلف اوقات میں شایع ہونے والے منتشر پرچوں میں ع

شعلہ سے ٹوٹ کے مثلِ شررِ آوارہ نہ ہوں

چنانچہ ایک ہی موضوع سے متعلق آپ کے خاص خاص مضامین کے انتخابات "مردوں کی مسیحائی" اور "محمد علی" کے نام سے بزیور طبع آراستہ ہو چکے ہیں۔ اب اسی بہار آفریں چمن سے گلہائے رنگ رنگ کا ایک گلدستہ اہلِ نظر کی ضیافت کے لیے پیش کیا جارہا ہے کہ ع چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

آغاز میں رخش عمر کی روانی پر ایک رواں دواں تبصرہ ہے۔ اس کے بعد اس ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ مدیر صدق کے ادبی اور انتقادی مضامین پر مشتمل ہے۔ اُردو میں ادبی نقد و تبصرہ کی تاریخ سیچ اور صدق کے تبصرہ اور تنقید کی قدر و قیمت کو کبھی نظرانداز نہیں کرسکتی ان مضامین سے نقاد کی نکتہ رس نظر، ذوق انتخاب اور کھوٹے اور کھرے کو پرکھنے کی خاص صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ دل کھول کر محاسن کی داد دیتے ہیں۔ آپ کے نقد و نظر کے ساتھ فکر کے مرکزی اور بنیادی اصول ہمیشہ ہم آہنگ رہتے ہیں۔ ان مضامین سے ہم تنقید کے بعض اصول کا استنباط کرسکتے ہیں اور تبصرہ کے کئی محاسن کو ان کے مختلف مقامات اور مثالوں سے واضح کرسکتے ہیں۔

"میری محسن کتابوں" میں آپ نہ صرف بے تعلق تبصرہ دیکھینگے۔ بلکہ اس اثر کا پورا اندازہ کرینگے جو مصنف نے بعض کتابوں سے قبول کیا ہے۔ تالستائی اور گاندھی جی کی سوانح میں آپکو ایسے بعض بیانات ملیں گے جس میں انھوں نے بعض کتابوں کے اثر و تاثر کو نہایت موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اُردو میں ایسی چند مثالیں ہیں۔ اور یہ ان میں ایسی دلکش جیسے موسم گل اور اس درجہ دلاویز جیسے نغمۂ بلبل۔

دوسری فارسی یا اردو کی کتابوں پر انتقاد کے سلسلہ میں یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کو جوہر دار آئینہ بنانا کسے کہتے ہیں۔

بعض مشاہیر عصر کے تذکرے ہیں۔ ان ناموران عصر کے کردار الفاظ کے جامہ میں زندۂ جاوید

ہوگئے ہیں۔ یہ مقالات ہمیں نہ صرف ان کی صحبت میں بلکہ ان کی تحریکات اور انکے تاریخی ماحول میں پہنچا دیتے ہیں۔ شخصی خصوصیات کی یہ وضاحت اور بیان کی فصاحت کا یہ کمالِ تناسب، توازن سیرت اور سوانح لکھنے والوں کے سامنے انہیں نمونہ اور معیار کے طور پر پیش کرتا رہیگا۔

آپ کا حکیمانہ ذوق اور عارفانہ مذاق اس مجموعہ کے فلسفیانہ اور مذہبی مضامین سے ظاہر ہوتا ہے یہ آپکی جدت، علمیت، اعتدال پسندی اور ذوق جستجو کے آئینہ دار ہیں۔ مذہب و حکمت کے بغیر کسی زبان کا ادب انسانی خودی کو مستحکم نہیں کر سکتا۔ آپ کے یہ مضامین فسون و افسانہ نہیں بلکہ عینِ حیات ہیں۔ بقول اقبالؒ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

یہیں سے آپ کے مضامین کے امتیازی جوہر کھلتے ہیں۔ عام طور پر انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے صرف زبان کے چٹخاروں، ادبی لطائف اور استعاروں کی نزاکتوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ سر سید مرحوم نے اُردو میں انگریزی طرز کی مضمون نگاری Essay writing کو مقبول عام بنا دیا۔ یہ صرف آغاز تھا۔ اس باب میں ابھی بہت کم ذخیرہ ایسا تھا جو اہلِ نظر کے نزدیک اعلیٰ علمی اور ادبی قدر و قیمت کا یکساں مستحق سمجھا جائے۔ جو ادیب مایۂ ناز تھے ان میں سے اکثر جدید علوم و فنون میں مسلمہ مہارت نہ رکھتے تھے۔ علوم جدیدہ میں مہارت رکھنے والے اکثر انگریزی اسالیب بیان سے اس درجہ متاثر تھے کہ جب لکھتے تو اُردو کی طرحداری قائم نہ رکھ سکتے۔ یہ امتیازی شان رکھنے والے بلند پایہ ادیبوں اور صاحبانِ علم و فضل میں مولانا ماجد صاحب کا بھی شمار ہے۔ یہاں علم و تحقیق کا رنگ جدید ہے تو زبان و بیان کا معیار مستند اور ٹکسالی۔ ان مضامین پر ایک سرسری نگاہ سے بھی صاحب نظر آدمی کو ان کے خصوصی محاسن کا احساس ہو جائیگا۔ علمی مسائل میں تحقیق سنجیدہ اور بلند مرتبہ ہے تو طرزِ اظہار سادہ و پرکار۔ مباحث کا تجزیہ چشم کشا ہے۔ محنت اور دیدہ ریزی کی ہر قدم پر دلیل آشکار ہے۔ ابدی حقائق سے مضمون نگار کی نظر اس درجہ آشنا ہے کہ مضامین محض کسی وقتی دلچسپی کے بجائے انسانی زیست کا نہایت دیرپا سرمایہ بن گئے ہیں۔

کئی ایسے عام اور ہنگامی مسائل ہیں جن پر بہ تقاضائے وقت اخبار میں اظہار رائے ضروری تھا۔ لیکن جن دائمی اصولوں کی روشنی میں ان پر بحث کی گئی ہے اور استدلال کی جس قوت اور دقت کو کام میں لایا گیا ہے۔ ان کے باعث یہ مضامین وقتی مقبولیت سے بالاتر ہو گئے ہیں اور ہمیشہ نکتہ رسی اور

زورِ استدلال کے اعلیٰ نمونے بنے رہینگے۔ ان مضامین میں کئی ایسے افکار تازہ ہیں جو اُردو زبان میں اس سے پہلے کبھی بیان نہیں کئے گئے۔ مذہبی رنگ کے مباحث میں کامل علمی شان اور تحقیق کی آن پائی جاتی ہے۔ یہ صرف خوش عقیدگی کو گرمانے کے کام کے نہیں۔ طالب حق کے ذوق جستجو اور اضطراب کو مطمئن کرتے ہیں۔ ان مقالات میں مصنف کی یکسوئی اور توجہ درجۂ کمال پر ظاہر ہے جسکو انگریزی میں Single minded devotion, کہتے ہیں۔ باطل کی تردید میں علمی تدقیق اور فلسفیانہ تنقید کے ساتھ ساتھ ایک پر جوش داعی حق کا نفسیاتی غضب بھی برمحل ظاہر ہوتا ہے۔ ان سے ہم یہ سیکھ پاتے ہیں کہ کیونکر ضمیر کی روشنی اور دل کی غیرت و حمیت کو ایک دوسرے کے ساتھ سمویا جا سکتا ہے۔ ایسے مضامین ایکطرف خیالات اور جذبات کی تربیت اور انکے اظہار کیلئے معیار بنکر ہماری آئندہ نسلوں کی تطہیر اور تعمیر فکر میں بڑا کام دینگے دوسری طرف وہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کے خاص پہلوؤں کی ترجمانی کرتے رہینگے۔ مضامین اور انشاء میں انفرادیت خاص چیز ہے۔ یہ انفرادیت جسطرح اسلوب بیان میں ظاہر ہوتی ہے خیالات کی رو سے بھی اسکا بڑا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دلآویز اور دلکش ادبی ذخیرہ میں انفرادیت کامل طور پر جلوہ گر ہے جسے دیکھکر آپ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ ع لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوا۔

موضوع کوئی ہو ادبی محاسن ہر رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ چارلس وہبلی نے مشہور انگریزی ادیب ہیزلٹ کی بابت لکھا ہے کہ گویا وہ اپنے ہاتھ میں قلم لیے پیدا ہوا۔ اسیطرح بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولنا عبد الماجد بھی فطری اور پیدائشی ادیب اور اہل قلم ہیں۔ جناب سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اردو میں کس قدر سچی بات لکھی ہے کہ

"آپ کی ذات ادب اردو کیلئے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہنچتے رہتے ہیں"۔

مخفی نہ رہے کہ شایع ہونیوالی ان تینوں کتابوں میں بھی مدیر صدق کے سارے بہترین مضامین جمع نہ کیے جا سکے بعض مضامین بروقت نہ مل سکے۔ جو کچھ مل گئے ان سب کی اشاعت بھی ممکن نہ ہو سکی۔ ان دنوں دامن کاغذ تنگ ہے اور گلچین بہار کا گلہ اسی سے ہے ع گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد۔

یوں تو دل کے ارمان بہت نکلنے پر بھی کم ہیں حضرت مصنف اور جناب ناشر کی کئی خواہشیں ایسی ہیں جن کی تکمیل نہ ہو سکی اور جو موقع کی منتظر ہیں۔ اب جلدی میں تو جو کچھ اور جیسے کچھ بن پڑا ہم ناظرین کے مشتاق ہاتھوں اور نگاہوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ہم تو در اصل تہیۂ طوفان کیے بیٹھے ہیں۔ ناظرین کی قدر شناسی کی ہمیں چھیڑ ہوئی اور پھر ہمارے جوش شوق کو دیکھئے اس نازک دور میں اس قدر ضخیم کتاب کی ترتیب طباعت اور اشاعت اقبال سلیم صاحب ہی کے پیہم اصرار اور گرمی کار کی بدولت ممکن ہوئی۔

نیاز کیش

غلام دستگیر رشید

لکچرار نظام کالج

عمر کے چالیس سال

میری پیدائش ۹۲ء۱۸ کی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں سال مسیحی کے حساب سے عمر پوری چالیس سال کی ہوگئی۔ سنہ ہجری کے حساب سے کچھ اور زائد ہوئی۔ بچپن میں جب چالیس سال کا نام سنتا تھا تو اس عمر کو دور اور بہت ہی دور بعید اور بہت ہی بعید سمجھتا تھا۔ خیال یہ رہا کہ اس کے آنے میں بڑی دیر ہے۔ بچپن اور لڑکپن، نوجوانی اور جوانی کا سارا زمانہ، خواب و خیال کی تیزی سے سونے اور کھیلنے میں گذر گیا۔ جس گھڑی کو بہت دور سمجھا تھا وہ بہت ہی قریب نکلی۔ جس وقت کا فاصلہ طویل سمجھا تھا، وہ پلک مارتے آپہنچا۔ بچپن کی آرزوئیں اور جوانی کی حسرتیں، دل کی دل ہی میں تھیں، کہ صبح کا گجر بج گیا۔ غفلتیں جوں کی توں تھیں کہ فرصتوں کی عمر ختم ہوگئی۔ بےفکریوں اور سرمستیوں کی تاریکیاں، تہ بہ تہ، بدستور تھیں، کہ مہلتوں کی عمر آخر ہوگئی۔

بچپن میں جب کسی کی عمر چالیس سال کی سنتا تھا، تو سمجھتا تھا کہ وہ بڈھا ہو چکا اور اس سن پر جب آدمی پہنچتا ہے تو خواہشیں مردہ ہو چکتی ہیں، نفس قابو میں آجاتا ہے، عقل و فہم، علم و عمل سب میں پختگی آجاتی ہے۔ آہ، کہ جب اپنا یہ سن آیا تو معلوم ہوا کہ یہ سارا حسن ظن ایک طفلانہ خام خیالی سے زائد نہ تھا۔ دوسروں پر جو کچھ گذرتی ہو، اپنی سرگذشت تو یہ ہے کہ نہ تو خواہشوں میں ایک ذرہ ضعف آیا نہ نفس کی

شرارت و سرکشی میں رتی برابر کمی ہوئی، نہ طبیعت میں متانت پیدا ہوئی نہ مزاج میں سنجیدگی آئی۔ نہ اخلاق ہی درست ہوئے نہ اعمال کی اصلاح نصیب ہیں آئی، نہ اللہ کی طرف رجوع نصیب ہوا، نہ انجام کا خیال دل پر غالب آیا، نہ عبرتیں حاصل ہوئیں نہ بصیرتیں۔ وہی غفلتیں اور وہی گمراہیاں، وہی ٹھوکریں اور وہی تیہ کاریاں۔ مزاج جو کل تھا وہی آج۔ غفلتوں کا جو ماضی تھا وہی حال۔ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد کہ

چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاجِ تو از حال طفلی نہ گشت

کسی کے حق میں قال ہوگا، اپنے حق میں حال، دوسروں کے لیے محض حکایت ہوگی، اپنے لیے تو آپ بیتی!

انبیاء کرام عموماً اسی سن میں مبعوث ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کو منصبِ رسالت اسی سن میں ملا ہے۔ سورہ احقاف کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر الٰہی میں رشد اور پختگی کا سن اسی کو قرار دیا گیا ہے۔ پر آہ، جو بدنصیب اس منزل تک پہنچ کر بھی خالی ہاتھ رہا جو پیر نابالغ، بوڑھا ہو کر بھی بچہ بنا رہا۔ وہ اپنی کوتاہ بختیوں اور محرومیوں کا گلہ مخلوق میں سے کس کس کے سامنے کرے اور اپنے رنج و حرمان کا دکھڑا کس کس کے آگے روتا پھرے؟

صد ہزاراں دام و دانست ای خدا ما چو مرغانِ حریصِ بے نوا
می رہانی ہر دمے مارا و باز سوئے دامے می رویم اے بے نیاز
ما ز آز و حرصِ خود را سوختیم ویں دعا را ہم ز تو آموختیم
از ہمہ نا امید گشتم اے خدا اول و آخر توئی و منتہا

حاصلِ عمر

حج و زیارت

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم

واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ (بقر - ع ۸) الحج اشہر معلومات (بقر - ع ۹)

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین فیہ آیات بینات مقام ابراہیم ومن دخلہ کان آمنا وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللّٰہ غنی عن العالمین (آل عمران - رکوع ۱)

عن عائشۃ قلت یارسول اللّٰہ تری الجہاد افضل الاعمال افلا نجاھد قال لکن افضل الجہاد واجملہ حج مبرور (بخاری) عن ابن مسعود قال رسول اللّٰہ صلعم تابعوا بین الحج والعمرۃ فانہما ینفیان الذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید والذہب والفضۃ ولیس للحجۃ مبرورۃ ثواب الا الجنۃ (ترمذی) عن ابی امامۃ قال رسول اللّٰہ صلعم من لم تمنعہ من الحج حاجۃ ظاہرۃ او سلطان جائر او مرض حابس فمات ولم یحج فلیمت ان شاء یہودیا وان شاء نصرانیا (جمع الفوائد)

لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لا شریک لک!

یہ الوداع، ماہ رمضان کی سالانہ الوداع نہیں، ناظرین سچ سے انکے خادم مدیر سچ کی الوداع ہے۔

حجِ بیت اللہ، چند شرائط کے جمع ہوجانے پر، ہر مسلمان پر اسی طرح فرض عین ہے، جس طرح ہر روز پانچ وقت کی نماز۔ یہاں نماز ہی کا فریضہ کب ادا ہو پاتا ہے جس میں نہ کچھ خرچ ہے اور نہ کوئی خاص محنت، کہ فریضۂ حج کے نہ ادا کرنے کا رونا رویا جائے۔ عمر کی گھڑیاں خاموشی اور تیزی کے ساتھ گذرتی رہیں، دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے رہے، اور اس فریضہ کی ادائی کا خیال تک نہ آیا۔ کلام مجید کی آیات میں اور رسولِ برحق کی احادیث میں، خدا معلوم کتنی بار ادائے حج کی فرضیت اور تاکید نظر سے گذری، اور عدم ادائے حج کی وعیدیں بار بار پڑھیں، پر قلب کی غفلتوں، نفس کی شرارتوں اور ہوش و خرد کی ہرزہ کاریوں نے ہمیشہ مشورہ یہی دیا، کہ یہ اوامر واحکام دوسروں کیلیے ہیں، اپنے کو ان سے کیا تعلق! اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ عمر کی کتنی بیش بہا فرصتیں، اور زندگی کی کتنی جا کر نہ آنیوالی مہلتیں، اسی غفلت، اسی بےحسی اور اسی قساوت قلب کی نذر ہوگئیں۔

ہندوستان کے طول و عرض میں بیشمار سفر بہ ضرورت اور بلا ضرورت، کر ڈالے، لیکن جو ایک ہی جگہ سفر کرنے اور حاضری دینے کی تھی، وہاں سر کے بل چلنا کجا، پیروں کے بل بھی جانا نصیب میں نہ آیا! بنگلوں اور کوٹھیوں حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کے گرد چکر لگانے میں ایک عمر گذر گئی، پر وہ آستانِ پاک، جو اس قابل تھا کہ اس کے گرد طواف کرنے میں ساری عمر تمام کردی جاتی، اور اسی پر پروانہ وار اپنی جان نثار کردی جاتی، گردشِ تقدیر نے محروم رکھا، تو اسی کی جبیں سائی سے! ملک کے گوشہ گوشہ کی سیر کر ڈالی، پر نہ توفیق ہوئی، تو ایک اس سرزمین کی زیارت سے شرف ہونیکی، جس کی سربلندی پر آسمان کو بھی رشک ہے جہاں کھڑے ہو کر اللہ کے خلیل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے اپنے رب کی توحید کی منادی کی تھی، اور جس کی ریگ کے ذرّوں پر اللہ کے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقشِ قدم آج تک ثبت ہیں!

محرومیوں کی حکایت دراز، اور گونہ بختیوں کا سلسلہ طویل، لیکن رحمت باری بے حساب اور فضلِ خداوندی بیکراں۔ بڑے بڑے مجرم اپنی سیہ کاریوں کی پوٹ لیکر آئے، اور بحرِ کرم کے ایک قطرہ نے سارے دفتروں کی سیاہیاں دم بھر میں سفیدی سے بدل دیں! روتے کانپتے آئے اور ہنستے کھلکھلاتے واپس گئے! اقلیم سخن کے تاجدار، خسرو نامدار نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

قطرۂ ز آبِ رحمتِ تو بس ست
شستنِ نامۂ سیاہ ہمہ!

اور ایک دہقانی کج مج زبان نے اپنی بولی میں یوں عرض کیا ہے:

سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے　　دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا!

بالآخر، جس کی رحمت ابر کرم بن کر سوکھی کھیتیوں کو آن کی آن میں سرسبز و شاداب کر دیتی ہے اس کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ایک محروم عمل، مُردہ قلب کو اپنے حرم محترم کی حاضری وطواف، اور اپنے حبیب پاکؐ کی آرامگاہ کی زیارت سے مشرف فرمادے۔ چنانچہ ارادہ ہوا، منصوبے بندھے اور زبان پہلی بار لبیک اللہم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک کے تلفظ پر کھلی!

اللہ اللہ! کجا ایک ننگ خلائق اور کہاں وہ قدسیوں اور نورانیوں والی سرزمین! کہاں ایک روسیاہ کے ناپاک قدم اور کہاں وہ معصوموں اور ملکوتیوں کی سجدہ گاہ! ایاز قدر خود بشناس عقل اس خوش قسمتی پر دنگ، خرد اس بوالعجبی پر حیران!

ہے آرزو کہ ابروِ پُرخم کو دیکھیے!　　اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے!

لیکن ربوبیت کے عجائب کاروبار ہیں۔ اپنا نام رب العٰلمین ارشاد فرمایا ہے۔ رب الصالحین نہیں فرمایا۔ مرتبۂ کمال پر صرف اتقیا، وصالحین، ابرار و اخیار ہی نہیں پہنچائے جاتے، ربوبیت کا تعلق اشرار و فجار سے بھی ہے۔ دستگیری صرف نیکوں ہی کی نہیں۔ بدوں اور بدتر سے بدتر بدوں کی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ہوائے بہار جب چلتی ہے تو چمن کے خوشبودار پھولوں اور چراگاہ کی گھاس کی پتیوں دونوں کو مہکا دیتی ہے ؎　اے بدر ماندگی پناہ ہمہ　؎　کرم تست عذر خواہ ہمہ

غرض نیت قائم ہو چکی ہے۔ حج کے مہینے تین ہیں۔ شوال، ذیقعدہ، و عشرہ اول ذی الحجہ۔ الحج اشہر معلومات۔ جس تاریخ کو ماہ مبارک رمضان ختم ہوتا ہے ٹھیک اسی تاریخ سے موسم حج کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ انشاء اللہ یکم شوال کو گھر سے نکلنا ہوگا، اور ۳ شوال کو ۱۰ بجے شب کے اکسپرس سے لکھنؤ سے بمبئی کے لیے روانگی اور ۵ شوال کو بمبئی پہنچ کر مغل کمپنی کے پہلے جہاز سے عزم سفر پہلے زیارت دیار حبیبؐ و حاضری روضۂ انور جتنے دنوں تک بھی قسمت یاوری کرے۔ پھر آغاز ذی الحجہ میں فریضۂ حج کے لیے مکہ معظمہ۔ بعد ادائے فریضہ قصد مراجعت، اور اگر زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ اول عشرۂ محرم میں واپسی وطن۔ یہ سارے ارادے اپنے ہیں، اور بندوں کو اپنے ارادوں کے نفاذ پر جو قدرت ہے اس کا حال معلوم! ہوگا وہی جو کچھ بندہ کا چاہا نہیں۔ بلکہ بندوں کے پروردگار و مالک کا چاہا ہوگا۔ کیا ایک مشت خاک اور کیا اس کے ارادے!

ارادہ کا حق تو اسی کو ہے، جس کے ہاتھ میں موت و زندگی، عاقبت و سلامتی کی کنجیاں ہیں۔ مولا کی شانِ کریمی دیکھیے کہ مولانا مناظر احسن صاحب جیسے صاحب ذوق و صاحب علم بزرگ، اور ایک دوسرے مخلص کی (جن کے خلوص کا اندازہ ناظرین سچ کو نہیں، صرف مدیر سچ کو ہے) معیت کی سعادت اور رفاقت کی دولت بھی نصیب میں آرہی ہے ان شاء اللہ العزیز۔

سچ اس مدت میں کیونکر جاری رہ سکیگا؟ افسوس ہے کہ اس کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکل سکی۔ مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اسکی اشاعت بارہ تیرہ ہفتوں کیلیے بند رہے۔ وسط جون تک اس خادم کی واپسی کی توقع ہے، ایک دو ہفتے کے آرام کے بعد شروع جولائی سے پھر اسی خدمت کا اجراء ہو سکتا ہے۔ البتہ اوسط مارچ سے آخر مارچ تک کے پرچوں کے مضامین فراہم کیے جاتا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں مولوی ظفر الملک صاحب ان پرچوں کو شایع فرمادینگے۔ اس حساب سے ناظرین کو صرف تین مہینے کے لیے زحمت انتظار برداشت کرنی ہوگی۔ سچ سے محبت و حسنِ ظن رکھنے والے بھائیوں کیلیے یہ مدت بھی بہت ہے اور خوب جانتا ہوں، کہ انھیں اس قدر انتظار بھی نہایت شاق گذریگا۔ لیکن سچ پوچھیے، تو التوا کی مدت کون ایسی بڑی مدت ہے، اور سچ کا نکلتے رہنا ہی کیوں اتنا اہم اور ضروری فرض کر لیا گیا ہے۔ جو اس کی سہ ماہی التوا پر اس قدر رنج و غم کیا جائے! آخر ؎ غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں! دورانِ سفر میں کچھ لکھنے کی نوبت ہی کیوں آنے لگی، لیکن اگر کچھ لکھنے کی نوبت آئی تو اسکی اشاعت کے اولین حقدار روزنامہ ہمدرد (دہلی) کے صفحات ہیں۔

آداب سفر حج سے ہے کہ اس سفر کو سفر آخرت کا نمونہ سمجھے احرام کی چادروں کو کفن کی چادروں کا نمونہ تصور کرے، اور چلتے وقت اپنے تمام ملنے والوں اور اپنے سے تمام تعلق رکھنے والوں سے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرے۔ ناظرین سچ تک فرداً فرداً پہنچنا ممکن نہیں۔ ان کے حقوق کی ادائی میں مدیر سچ کی جانب سے خدا معلوم کتنی غفلتیں اور کتنی کوتاہیاں ابتک ہوئی ہونگی اور خدا معلوم کتنوں کی دلآزاریاں ان اوراق کے ذریعے سے ہو چکی ہونگی۔ سب کی خدمت میں بہ منت و لجاجت گزارش ہے کہ اپنے اس خادم کی بڑی اور چھوٹی، دانستہ اور نادانستہ، ساری خطاؤں کو اللہ کے واسطے صدق دل سے معاف فرمائیں۔ وہ جو حاکموں کا حاکم ہے ان کی خطاؤں کو بھی معاف فرمائے گا۔ اس دربار کے سچے سفیر کی بشارتیں اور وعدے موجود ہیں۔

التماس عفو کے بعد دوسری گزارش سچ کی برادری سے یہ ہے کہ اس خادم کو دعائے خیر سے محروم نہ کیا جائے ۔ اور زاہد و فاسق سب کی سننے والے کی بارگاہ میں بار بار عرض کیا جائے کہ اس گنہگار کو حج مبرور اور زیارت مقبول نصیب ہو ۔ حکم ملا ہے کہ توشۂ سفر کا سامان رکھو اور پھر خود ہی ارشاد ہوا ہے کہ بہترین توشۂ سفر تقویٰ ہے (وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰی) یہاں تقویٰ کا سایہ بھی نہیں پڑنے پایا ۔ ہمارا جو کچھ ہے وہ کسی رؤف و رحیم کی رحمت بےحساب اور کرم بےاندازہ کا ہے اور اسکے بعد اگر کسی توشہ کی طلب و ہوس ہے تو وہ اہلِ دل کی دعائیں ہیں ۔ زہے نصیب اسکے جسکے نصیب میں توشہ آ جائے! شانِ کریمی کے حوصلے دیکھنا! کیسے نامہ سیاہ کو نوازا جا رہا ہے! کس ننگ خلائق کو سرفراز کیا جا رہا ہے! شاعر نے صدیوں پیشتر اپنی تخیل کی رَو میں کہا تھا ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم نہ دادند ۔ تو برون در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی!

وہاں تو شاعری تھی پر اپنی طرف دیکھ کر دل دھڑک رہا ہے اور ہمت جواب دے رہی ہے کہ کہیں اپنے حق میں یہ شاعری اجرائے حقیقت نہ بن جائے! مولیٰ ہر بیکس کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے! ہر مفلس کا آسرا تیرا ہی دستِ کرم ہے! بلایا ہے تو اپنے در سے محروم نہ واپس کرنا! اپنے اس قہر و غضب سے پناہ میں رکھنا کہ اس آستانِ پاک تک پہنچ کر بھی تیرا بھکاری خالی ہاتھ واپس آئے! اندھے کی آنکھیں روشن کر کے رہنا نہ ہو کہ خانہ تک پہنچ کر صاحبِ خانہ کے دیدار سے محرومی رہے! نہ ہو کہ مکان پر حاضری کے بعد بھی لامکان والے مکین کی تجلیات حجاب ہی میں رہیں! بیت کے ساتھ ربّ البیت کے انوارِ جمال کی زیارت نصیب ہو! مُردوں کو جلانے والے مالک! مایوسوں کو خوشخبری دینے والے مولیٰ! بیکسوں کی دستگیری کرنے والے آقا! دلوں کے زخم پر مرہم رکھنے والے پروردگار! تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام تیرے اور تیرے حبیبؐ کے آستانِ پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے دعاؤں کا قبول کرنا تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں!

اے خدائے پاک بے انباز و یار ۔ دست گیر و جرم ما را درگزار

یاد دہ ما را سخنہائے رفیق ۔ کہ ترا رحم آورد آں اے رفیق

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ۔ ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

گر خطا گفتیم اصلاحش تو کن ۔ مصلحی تو اے تو اصلاح سخن

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔

میری محسن کتابیں

(اس عنوان سے رسالۂ الندوہ (لکھنؤ) میں ایک سلسلۂ مضامین مختلف اصحاب کے قلم سے شایع ہو رہا ہے، ذیل کا مضمون مدیر صدق کے قلم سے اسی سلسلہ کی ایک قسط ہے)

حکم ملا ہے ایک رند خراباتی کو، ایک گمنام اور بدنام، گوشہ نشین قصباتی کو کہ وہ بھی اہلِ فضل و کمال کی صف میں در آئے اور اپنا افسانۂ رسوائی دنیا کو کہہ سنائے اور یہ حکم دینے والے کون! ایک بزرگ[۱] صورت و بزرگ سیرت خورد[۲]۔ بہتر بزرگوں اور خوردوں کو اگر لطف اسی داستان میں آتا ہے تو لیجیے تعمیل فرمائش ابھی ہوئی جاتی ہے لیکن آپ حضرات بھی تو سوچ سمجھ لیں، دنیا آپ کے حسن انتخاب کو کیا کہیگی! ؎ تو پسند آئیں ادائیں انھیں دیوانوں کی!

آنکھ کھلی ایک خاصے مذہبی گھرانے میں۔ باپ (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) ایک اچھے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود علماً مولوی اور عملاً دیندار ماں (اللہ ان کی عمر میں مزید برکت عطا فرمائے) شب بیدار، تہجد گزار، زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر کا۔ گھر پر مشرقی تعلیم کا چلن ایک حد تک باقی تھا۔ مولوی صاحب کے پاس بٹھائے گئے۔ قرآن (ناظرہ) کے ساتھ ساتھ اردو بھی شروع ہو گئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم کی ریڈریں کچھ اس طرح مزہ لے لیکر پڑھیں کہ ان کی شیرینی ابتک

---

[۱] مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

[۲] علی میاں سلمہٗ ایڈیٹر الندوہ

یاد ہے اور اردو ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی لکھنی آئی اُس کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں، رقعات قتیل، یوسف زلیخا کے علاوہ کیمیائے سعادت بھی کچھ سمجھے اور زیادہ تر بے سمجھے جوں توں ختم کر ڈالی، داخلہ اسکول میں ہوا۔ زبان عربی لی۔ استاد شفیق ملے۔ عربی سے جو الجھن اور وحشت نہ ہونے پائی تصرف ہے انھیں بزرگوں کا۔

ابھی بچپن ہی تھا کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ "چچازاد" بھائی نے شوق اخبارات کا پیدا کرا دیا۔ دل خارجی مطالعہ میں لگنے لگا۔ اخبار، رسالہ، اشتہار، کتاب جو چھپی چیز بھی سامنے آجاتی مجال نہ تھی کہ بچ کر نکل جائے۔ اُردو کے علاوہ انگریزی، فارسی، عربی میں کچھ شُد بُد تو ہو ہی گئی تھی، فقہ، تصوف، منطق، مناظرہ، ادب، فسانے ناول، ناٹک، طب، شاعری، سب ہی کچھ تو اس میں آگیا۔ جوش خاصا مذہبی موجود تھا، آریوں اور عیسائیوں کی مناظرانہ کتابوں پر نظر پڑی اک آگ سی لگ گئی۔ تلاش جوابات کی ہوئی۔ دُھن سی سوار ہو گئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی "ترک اسلام" وغیرہ مرزا غلام احمد قادیانی کی "سرمہ چشم آریہ" وغیرہ، حکیم نور الدین کی "نور الدین" مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوہ کا ماہنامہ "تحفہ محمدیہ" اسی دور کی یادگار ہیں۔ اور ہاں ایک نام تو ذہن سے نکلا ہی جاتا تھا۔ اب وہ بیچارے یوں بھی گمنام ہو گئے ہیں، مولوی احسان اللہ عباسی وکیل گورکھپور مصنف "الاسلام" "تاریخ الاسلام" وغیرہ۔ ذوق و شوق سے ساری کتابیں پڑھیں، اور اپنی بساط کے لائق کچھ لکھا لکھایا بھی۔ ادبی میدان میں شرر مرحوم، اور ان کے معاصرین منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ وغیرہ کا دور دورہ رہا۔

یہ دَور کہنا چاہئے کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک رہا۔ ۱۹۰۷ء میں نیاز "مقالات شبلی" اور "الکلام" سے حاصل ہوا۔ اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش اُن کی اور تحریروں کی شروع ہوئی۔ انھیں پڑھتا نہ تھا، تلاوت کرتا تھا۔ "الندوہ" والد مرحوم کے نام سے جاری کرایا۔ پرانے پرچے منگائے۔ تازہ پرچہ کے دن

گنا کرتا۔ مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھتا۔ فقرے کے فقرے حفظ ہو گئے ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ ہم سنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں، نذیر احمد، حالی، سرسید، آزاد کے ساتھ بھی حسنِ اعتقاد قائم رہا۔

۱۹۰۶ء میں عمر کا سولھواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر، لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا اور اب انگریزی کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک بڑے انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھل کر اور بڑے زوردار الفاظ میں مادیت کی حمایت اور مذہب و اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ عصمت اور نیک چلنی کے کوئی معنی نہیں محض پرانے لوگوں کا گڑھا ہوا ڈھکوسلا ہے۔ اصل شے صحت اور مادی راحت ہے صحت کا خیال رکھ کر جو کچھ جی میں آئے کرو۔ نکاح وغیرہ کی قیدیں سب لایعنی ہیں۔ مصنف کے پیش نظر اسلام یقیناً نہ تھا، لیکن زد تو بہر حال اسلام پر پڑتی تھی۔ خیالات ڈانوا ڈول ہونے لگے۔ اس زمانہ میں اتفاق سے ایک اور کتاب بھی نظر سے گذری۔ یہ ادبی تھی۔ مشاہیر عالم کے اقوال و خیالات پر اس میں ایک جگہ پورے قد کی تصویر صفحہ بھر پر رسول اللہ صلعم کی درج تھی اور نیچے سند یہ بھی تھی کہ فلاں (غالباً روما) کے میوزیم میں قلمی تصویر موجود ہے یہ اس کا فوٹو ہے۔ حلیہ یہ تھا:۔ سر پر عمامہ، جسم پر عبا، تلوار کمر سے بندھی ہوئی، شانہ پر ترکش، ہاتھ میں کمان، تیوروں پر بل پڑے ہوئے، آنکھوں سے غصہ، بشرہ سے تند خوئی عیاں، شان رحمتہ للعالمین الگ رہی، معمولی نرم دلی اور نیک مزاجی کے آثار بھی یکسر مفقود۔ نیچے سند درج۔ مغربیت سے مرعوب دماغ کے لئے اب شک و شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟

دماغ پہلے ہی مفلوج ہو چکا تھا، اب دل بھی مجروح ہو گیا۔ ارتداد دبے پاؤں آیا، اسلامیت کو مٹاتا، ایمان کو ہٹاتا، خود مسلط ہو گیا۔ آریت، مسیحیت دوسرے

مذاہب سے پہلے ہی سے دل ہٹا ہوا تھا، اب کھلم کھلا آزادی اور آزاد خیالی کی حکومت قائم ہو گئی۔ الحاد کا نشہ، بے دینی کی ترنگ "ریشنلزم" (عقلیت) سے پینگ بڑھے "ریگناسٹیزم (لاادریت) سے یارانہ گٹھا۔ لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلئیین) کی ممبری قبول کر، سارا وقت ہیوم، مل، اسپنسر، ہکسلے، ہیگل، انگرسول، بریڈلا، ایوشنز، ڈارون اور یونان کے حکماء، مادیین مینشگلین وغیرہ کی نذر ہونے لگا۔ مل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ لڑکوں میں مل کا حافظہ مشہور ہو گیا۔ ایک اور کتاب طب سے متعلق عضویات دماغی Organical Physeology پر ایک مشہور انگریز ڈاکٹر کی۔ اس زمانے میں نظر سے گذری ذکر امراض عصبی و دماغی کا تھا۔ بدبخت نے مرض صرع کے ضمن میں لکھا تھا کہ اس کی علامات کو لوگ پرانے زمانہ میں "وحی الٰہی" سمجھنے لگتے تھے، اور مصروع کے عام قوائے دماغی تو بہت اچھے ہوتے ہیں وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے، مذہب اور سلطنت دونوں قائم کر سکتا ہے وقس علی ہذا ـــــــ ارتداد، الحاد، اور اسلام بیزاری میں اگر کچھ کسر باقی تھی تو اب پوری ہو گئی۔ ایف اے کے امتحان کی فیس جانے لگی، تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا ہے وہاں بجائے مسلمان کے ریشنلسٹ لکھ دیا!

الحاد، بے دینی، یا عقلیت کا یہ دَور کوئی ۱۰ سال تک قائم رہا۔ یعنی ۱۹۰۹ء سے وسط ۱۹۱۸ء تک ایف اے، بی اے، کی تکمیل ہوئی[۱]۔ ایم اے کی تکمیل نہ ہوئی، لیکن تعلیم تو بہرحال فلسفہ لے کر پائی۔ مضمون نگاری، تصنیف، تالیف، اُردو، اور انگریزی دونوں زبانوں میں جاری رہی۔ ہوتے ہوتے ۱۹۱۸ء آ گیا۔ آخر سال تھا کہ ایک دوست کی تحریک پر انگریزی میں بودھ مذہب پر کتابیں دیکھیں اور دل کسی قدر ادھر مائل ہوا۔ معاً بعد ہندو فلسفہ کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ خصوصاً مسز بسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے انگریزی تراجم و تالیفات کے ذریعہ سے مغربیت، مادیت، اور عقلیت کا جو تیز نشہ سوار تھا، وہ بتدریج ہلکا ہونے لگا

---

[۱] انہماک خاص کے مضامین دو تھے ایک منطق دوسرے نفسیات۔ نفسیات میں سب سے زیادہ اثر امریکہ کے مشہور استاد فن ولیم جیمس کا رہا۔

اور دل اس کا قائل ہوگیا کہ مادّی اور حسّی دنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالم کا وجود ہے ضرور۔ بھگوت گیتا کا انگریزی ایڈیشن (مسز بسنٹ کا ترجمہ) اِس حیثیت سے اکسیر ثابت ہوا خدا کا نام اب قابل مضحکہ نہ رہا، "روح اور روحانیت" کے الفاظ سے نفرت و بیزاری دور ہوگئی، ہاں اسی درمیان میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول شایع ہوچکی تھی اسے خوب غور سے پڑھا تھا، اور اس سے بھی اچھا اثر قبول کیا تھا۔ صاحب سیرت کی رسالت پر ایمان تو اب بھی دور کی چیز تھی، لیکن مارگولیس وغیرہ کے اثر سے (نعوذ باللہ) جو ایک خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہوگیا تھا، آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرت کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک خوش نیت مصلح قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔

اب دل مسلمان صوفیہ کے اقوال و احوال میں بھی لگنے لگا تھا کشف و کرامت کے ذکر پر اب یہ نہ ہوتا کہ بیساختہ ہنسی آجاتی، بلکہ تلاش اس قسم کے ملفوظات و منقولات کی رہنے لگی۔ فارسی اور اُردو کتابیں بہت سی اس سلسلہ میں پڑھ ڈالیں۔ مسلمان تو اب بھی نہ تھا، لیکن طغیان و عدوان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ محض کتابوں کے سلسلہ میں محض شخصیتوں کا ذکر یقیناً بے محل ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر آگے بڑھا نہیں جاتا کہ اس دَور میں دو باتیں زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں، جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی رفتار سے سہی، لیکن بہر حال اصلاحی ہی اثر قبول کرتی رہی۔ ایک اردو کے مشہور حکیم و ظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں، دوسرے کامریڈ کے ایڈیٹر اُس وقت کے "مسٹر" اور اسی درمیان میں "مولانا" ہوجانے والے محمد علی! ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسر قرآن کا بھی پڑتا رہا۔

۱۹۱۹ء قریب ختم تھا، ایک عزیز کے پاس مثنوی معنوی (کانپوری ایڈیشن) کے چھ ضخیم دفتر دکھائی دیے (اللہ رحمت اللہ رعد کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) کاغذ، کتابت، طباعت کے جملہ محاسن ظاہری سے آراستہ۔ حاشیہ نہایت مفصّل۔ چند سال ادھر توجہ بھی نہ کرتا، لیکن اب زمین پوری طرح تیار ہوچکی تھی، معدہ کو

غذا گھنٹہ اور منٹ کی پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت سے ملی۔ مطالعہ ذوق و شوق سے شروع کیا اور ہر قدم پر شوق کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ الفاظ ملنے مشکل ہیں، جن میں اس ذوق و شوق کی کیفیت بیان کی جائے، فارسی استعداد واجبی ہی تھی، سلوک و معرفت کے نکات و اسرار الگ رہے۔ ظاہری لفظی معنی بھی صدہا اشعار کے سمجھ میں نہ آئے، لیکن انہماک کا یہ عالم کہ ایک شعر بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا اور دل بے اختیار یہ چاہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سارے دفتروں کو ایک دم سے چاٹ جاؤں۔ کھانے پینے، ملنے جلنے تک کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت بیقرار کہ کمرہ بند کئے بس اسی کو شروع سے آخر تک پڑھے چلا جاؤں۔ ہر ہر شعر تیر و نشتر بن کر دل کے اندر پیوست ہوتا جاتا اور تشکیک، ارتیاب، عقلیت و لاادریت کے بادل سب چھٹتے چلے جاتے۔ حاشیے علمی رنگ کے دل کو زیادہ نہ بھاتے۔ خصوصاً شیخ ابن عربیؒ کے نظریات جہاں آجاتے وہاں تو دم الجھنے لگتا کہ یہ تو پھر وہی افلاطون وغیرہ کے طرز کی باتیں آگئیں جن سے گھبرا کر اور اکتا کر میں بھاگا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے چھوٹے، سادے اور پُر مغز حاشیے جہاں نظر پڑ جاتے طبیعت پھڑک جاتی، اور دل گواہی دے اٹھتا کہ بیشک یہ قول کسی سچے ہی کا ہوسکتا ہے۔

مولاناؒ نے حضرت رسالتؐ کے باب میں کہا ہے، کہ اس پر کسی معجزہ یا خارق عادت سے دلیل خارجی لانے کے کیا معنی، پیمبر کی تو ہر چیز بجائے خود ایک معجزہ ہوتی ہے۔

روے و آواز پیمبر معجزہ است

بس اپنا بالکل یہی حال خود مثنوی سے متعلق تھا۔ ہر شعر خود پکار کر شہادت دے رہا تھا کہ میں سچے ہی کی زبان سے نکلا ہوں، کسی اور دلیل و برہان کی حاجت ہی نہ تھی۔۔۔۔ مثنوی کا مطالعہ ہفتوں نہیں مہینوں مسلسل جاری رہا اور اس ساری مدت میں ایک نشہ سا سر پر سوار رہا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، بس اسی کی دھن، اسی عالم میں کہیں مر گیا ہوتا تو عجب نہیں کہ نکیرین کے سامنے مذہب کے

سوال پر جواب زبان سے یہی نکلتا کہ "وہی مذہب ہے جو مولانائے روم کا مذہب تھا"۔ قرآن و رسالت تک پر ابھی ایمان پختہ نہ تھا، بس دلیل سب سے بڑی یہی تھی کہ جب صاحب مثنوی اس پر ایمان رکھتے ہیں تو کیوں نہ یہ دین سچا ہوگا۔

غالباً اگست سنہ ۲۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا۔ مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسیوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دور ہو گئے۔ اور یہ رائے اب تک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں۔ اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکیں لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں ____ ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صحیح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے۔ تو یہ تو بہرحال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بناء پر ان کی ساری کوشش سے بدظن ہو جانا قرین انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔

نیم مسلمان ہو چکنے کے بعد پھر پورا مسلمان بن جانا اور ادخلوا فی السلم کافۃ کے تحت میں آجانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا اقبالؒ کی اردو اور فارسی نظمیں محمد علیؒ کی نظمیں اور تحریریں (خصوصاً زمانہ نظربندی سنہ ۲۱-۲۳ء کی) سب اپنا اپنا کام کرتی رہیں دل میں گھر کرتی گئیں۔ یہاں تک کہ مکتوبات مجددی نے اس پر پوری مُہر لگا دی مکتوبات کا جو امرتسری نسخہ متعدد جلدوں میں پیش نظر رہا وہ اپنی صفائی، خوشنمائی اور کثرت حواشی کے لحاظ سے گویا مثنوی ہی کے اسی کانپوری ایڈیشن کی ٹکر کا تھا اور اثر میں شاید اس سے کچھ ہی کم۔ مثنوی سے اگر طبیعت میں ایک شورش اور تڑپ پیدا ہو گئی تھی، تو اس میں سکون اور ٹھہراؤ مکتوبات ہی کی برکت سے حاصل ہوا۔ درمیان میں عطارؒ۔ سنائیؒ، جامیؒ، شیخ جیلانیؒ، غزالیؒ، سہروردیؒ وغیرہم اکابر شیوخ کی خدا معلوم

کتنی کتابیں نظم ونثر کی نظر سے گذر گئیں لیکن دل پر نقش انھیں دو کتابوں کا سب سے زیادہ گہرا بیٹھا رہا۔ پہلے مثنوی اور پھر مکتوبات۔ حالانکہ سمجھ میں دونوں کا بڑا حصہ اس وقت تو کیا آتا اب تک بھی نہیں آیا۔

حال کی انگریزی کتابوں میں ایک قابل ذکر کتاب اور یاد پڑ گئی یہ نومسلم یورپین لیوپولڈ ویس محمد اسد Islam on the Cross Road ہے۔ دیکھنے میں چھوٹی سی، معنویت کے لحاظ سے بہت بڑی اور گہری ہے۔ ہر انگریزی خواں کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ بڑی مسرت اسے پڑھ کر ہوئی کہ جو خیالات تہذیب فرنگ واسلام سے متعلق پہلے سے اپنے قائم ہو چکے تھے۔ یہ مغربی مفکر بھی گویا تمامتر اسی کی تائید کر رہا ہے۔

۲۷ء تھا کہ ایک دوست کی رہنمائی سے پہلے رسائی مولانا تھانوی مدظلہ کے مواعظ اور بعض رسائل سلوک تک ہوئی اور پھر ۲۸ء میں خود مولانا اور ان کی دوسری تصانیف تک اس نے حقائق دینی وعرفانی کا ایک نیا عالم نظر کے سامنے کر دیا اب ادھر چند سال سے مسلسل مشغلہ اس بے علم و نااہل کا خدمت قرآنی کا ہے اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹ جانے سے بھی وہ گہرے نکتے نہیں ملتے جو مفسر تھانوی کے ہاں چند سطروں کے اندر میسر آجاتے ہیں۔ معاصرت کا ابتلاء عجب ابتلا ہے، اللہ سب کو محفوظ رکھے جو دیکھنا نہیں چاہتے، انہیں آنکھیں چیر کر دکھایا بھی کیسے جاسکتا ہے؟ اور یہ صرف تفسیر یا دوسرے علوم ظاہری ہی پر موقوف نہیں ہے۔ علوم باطنی میں تو پایہ شاید کچھ بلند تر ہی نکلے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

محسن کتابوں کی تعداد ہے اتنی بڑی کہ سب کی تفصیل لکھی جائے تو بجائے خود ایک کتاب تیار ہو جائے۔ مختصر بلکہ مختصر تر اور مختصر یہ کہ حدیث میں صحیح بخاری اور اس کی شرح فتح الباری نے آنکھیں کھول دیں اور فقہ میں شرح صدر کے لئے آئمہ حنفیہ کے

اقوال بالکل کافی ثابت ہوئے۔ فہم قرآنی میں معروف و متداول تفسیروں کو معین و مفید پایا۔ ان کی بے وقعتی خود اپنی محرومی کی دلیل ہے۔ ان کتابوں کا نام اس بے تکلفی سے لے رہا ہوں کہ گویا سب کو رواں اور صحت اعراب کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ ذرا بھی صحیح نہیں۔ لغات، شروح، تراجم کے سہارے کام کسی نہ کسی طرح بس چل ہی جاتا ہے۔ لغت میں تاج العروس اور پھر لسان العرب کے ساتھ اور لغت قرآنی میں مفردات راغب کے ساتھ سب سے زیادہ لگا لپٹا رہتا ہوں۔

انسانی کتابوں کے ساتھ اور ان کے ضمن میں اللہ کی کتاب کا نام لے آنا اور دونوں میں موازنہ و تقابل کی ٹھہرانا بڑی ہی بدمذاقی ہے اور پھر محض کتابوں میں "کتابوں" (صیغۂ جمع) کا لفظ خود اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ال کتاب موضوع سے بالکل خارج ہے ؎

مثنوی

صاحب مثنوی کی زبان سے

"مثنوی" کو اللہ نے جو حسنِ قبول عطا فرمایا ہے، وہ دنیا کے ہر مصنف کے لئے باعث رشک ہو سکتا ہے۔ ادھر مطلق 'مثنوی' کا نام زبان پر آیا اور ادھر ہر سننے والا سمجھ گیا۔ کہ اس سے مراد حضرت مولانائے رومؒ ہی کی مثنوی ہے۔ ترجمہ اور شرحیں اب تک خدا جانے کتنی زبانوں میں کتنے قلم لکھ چکے، درس کتنی درسگاہوں میں کتنی بار ہو چکا، گرمی کتنی سرد اور سست محفلوں میں اسی کے اشعار پیدا کر چکے لیکن ہر تصنیف کا شاید سب سے زیادہ دلچسپ تعارف وہ ہوتا ہے جو خود مصنف کی زبان سے ہوتا ہے۔ آج کی صحبت میں مثنوی پر اسی حیثیت سے نظر کرنا ہے۔

مثنوی کل چھ دفتروں میں ہے۔ دفتر اول کے عام تمہیدی اشعار کے بعد ہی جہاں سے اصل کتاب کی حکایتیں شروع ہوتی ہیں، پہلی حکایت کے شروع میں اشعار ذیل ہیں:۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں خود حقیقت نقد حال ماست آں	دوستو، یہ داستان سنو، جو عین ہماری حقیقت حال کا آئینہ ہے۔
نقد حال خویش را گر پے بریم ہم ز دنیا ہم ز عقبیٰ برخوریم	ہمارے حال اگر ہم پر آئینہ ہو جایا کریں تو دنیا و عقبیٰ دونوں میں ہمارا نفع ہی نفع ہے
ایں حقیقت را شنو از گوشِ دل	اب ذرا اس حکایت کو غور کر کے دل لگا کے

تا بروں آئی بجلی زآب و گل | سنو کہ نفس و نفسانیت کی جکڑبندی سے ہائی نصیب ہو
فہم کردار یدو جاں را رہ دہید | ذرا سمجھ سے کام لیکر اور دل لگا کے اسے سن لو
بعد ازاں از شوق در رہ پا نہید | اسکے بعد شوق کے ساتھ راہ طلب میں قدم رکھو

گویا جو حکایتیں ہیں اُن کے پردہ میں حقائق کا سبق دینا مقصود ہے اور کوئی ان کے مغز تک پہنچ جائے، تو 'طریق' اُس پر منکشف ہو کر رہے اور سلوک و مجاہدہ کی راہیں اُس پر آسان ہو جائیں۔ ان اشعار میں لفظ 'مثنوی' نہیں آیا ہے، لیکن مثنوی کا مقصود و موضوع بالکل ظاہر ہو گیا ہے۔

شروع کی چندہی حکایات کے بعد ایک جگہ توحید کا وعظ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔ ؎

تا ز زہر و از شکر در نگزری | اے مخاطب، جب تک تو زہر و شکر دونوں
کے تو از گلزار وحدت بو بری | سے، یعنی عالم کثرت سے نہ گزر جائیگا، اور

اپنی توجہ والتفات کو اُدھر سے ہٹا نہ لے گا، باغ وحدت کی خوشبو، لذتِ توحید کبھی نصیب میں نہ آئے گی۔

اور اس کے معاً بعد مثنوی کا اصل موضوع سخن بیان فرمادیتے ہیں، کہ شاعری و تخییل آرائی نہیں، بلکہ محض درس توحید دینا ہے۔ ذوقاً بھی اور عملاً بھی ؎

وحدت اندر وحدت است ایں مثنوی | ہماری مثنوی میں، اول سے آخر تک، توحید
از سمک رو تا سماک اے معنوی | ہی توحید بھری ہوئی ہے۔ پس اے طالب

معنی، و جویائے حقیقت، عالم سفلی (سمک) کو چھوڑ، یکسر عالم علوی (سماک) کی طرف متوجہ اور ذاتِ حق کی طرف ملتفت ہو۔

اس دفتر کے وسط کے قریب ایک جگہ نام مثنوی کا آیا ہے، لیکن محض ضمناً۔ مولانا بیان عالم ارواح کی وسعت کا کر رہے ہیں، جو مقدار اور مادہ دونوں سے ماورا ہے۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں ؎

گر بود ایں چرخ دہ چندیں کہ ہست | یہ وسیع آسمان اگر دس گنا بھی وسیع

نیست نزد آں جہاں جز تنگ و پست | ہو جائے، جب بھی اس عالم کے سامنے
مثنوی در حجم گر بودے چو چرخ | تنگ و پست ہی رہیگا۔ اور مثنوی کی ضخامت
در نگنجیدے درو زیں نیم برخ | بڑھ کر آسمان کے برابر ہو جائے۔

جب بھی اُس عالم کے آدھے ٹکڑے کی وسعت نہ بیان ہو سکے گی۔

یہاں مثنوی کا نام گو محض ضمناً و تبعاً آیا ہے، تاہم اس کی حقیقت بیانی و حق ترجمانی کا وصف بیان ہو گیا۔

دفتر اول میں غالباً بس یہی وہ مقام ہیں، جہاں مثنوی کا تذکرہ کسی جہت سے آیا ہے۔ دفتر دوم، مقصد مثنوی کے اصلی اور مستقل تذکرہ سے خالی ہے۔ لیکن مثنوی کا نام بالکل ابتداء ہی میں متعدد بار آیا ہے، اور مولاناؒ کے محبوب مرید اور رفیق طریقت حسام الدین چلپیؒ کی مدح و منقبت کے ذیل میں مثنوی کی تاریخ تصنیف، و غایت تصنیف بھی معرض بیان میں آگئی ہیں ؎

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد | ایک مدت مثنوی کی تصنیف ملتوی رہی
مہلتے بایست تا خوں شیر شد | اور ہونی بھی چاہیئے تھی خون کو دودھ بنتے
تا نزاید بخت تو فرزندِ تو | آخر کچھ دیر لگتی ہے۔
خوں نہ گردد شیر شیریں، خوش شنو | خون دودھ میں اسی وقت تبدیل

ہو کر رہتا ہے، جب بچہ ہو چکتا ہے، یا ہونے والا ہوتا ہے۔

یعنی آمدِ مضامین کے لئے کوئی خاص داعیہ یا تحریک ہونی چاہیے۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں، کہ مثنوی لکھوانے والے حسام الدین چلپیؒ تھے، ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور وہ دو برس تک اس صدمہ میں مبتلا رہے اس لئے مثنوی کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ دو برس کے بعد اُن کے دوبارہ متوجہ ہوتے اور توجہ دلانے پر آمدِ مضامین پھر شروع ہوئی۔ صاحبِ مثنوی، التواءِ مثنوی اور از سر نو آغاز ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

چوں ضیاء الحق حسام الدیں عناں | ضیاء الحق حسام الدین، کہ انھیں کا فیض

بازگردانید ز اوج آسماں
چوں معراج حقائق رفتہ بُود
بے بہارش غنچۂ نشگفتہ بُود
چوں ز دریا سوئے ساحل باز گشت
چنگِ شعر مثنوی با ساز گشت

توجہ، مثنوی کو لکھوا رہا ہے، اپنی سیر حقائق باطنی میں مصروف و مستغرق تھے، اس نسیم بہار کے بغیر یہ غنچہ بِن کھلا رہا اب جب انھیں ہوش آیا، اور وہ دوبارہ ادھر متوجہ ہوئے اور سمندر سے ساحل کی طرف واپس آئے تو مثنوی کا سلسلہ از خود چل نکلا۔

بہ ظاہر، صاحبِ مثنوی کا بیان تذکرہ نویسوں کے بیان کے مخالف معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتہً دونوں میں تعارض کچھ بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں واقعات بالکل صحیح ہوں۔ اہل تذکرہ نے واقعہ کا صرف ظاہری پہلو لیا، اور بیوی کی وفات کو سبب قرار دیا۔ اور مولانا رح نے اُسی واقعہ کے باطنی پہلو کو لیا۔ یعنی محبوب بیوی کی مفارقت کے صدمہ سے قلب میں جو بلند کیفیات تضرع و شکستگی، انابت و رجوع الی اللہ کی پیدا ہوئیں، اور جو مقامات منکشف ہوئے، وہ خود ایک سبب اور ذریعہ بن گئے، ترقی مدارج باطنی اور قرب و وصول الی اللہ کے۔ اور شیخ چلپی رح ان باطنی لذتوں میں اِس قدر منہمک و مستغرق رہے، کہ افادۂ خلق کی جانب توجہ نہ رہی۔ اور اب جب اُس حالت سے افاقہ ہوا، تو پھر ادھر واپس آئے غلبۂ تجلیات کے وقت نبی جلیل القدر حضرت موسیٰ کلیم اللہ تک سے توریت لینا کلام کرنا، وغیرہ سب ملتوی رہا تھا۔

مثنوی کہ صیقل ارواح بُود
باز گشتش روز استفتاح بود
مطلع تاریخ ایں سودا و سُود
سالِ ہجرت شش صد و شصت و دہ بُود

مثنوی جس کا کام ارواح کو جلا دینا، اور زنگ سے صاف کرنا ہے، اور در حقائق و معارف کو کھولنا ہے اُس کے آغاز نو کی تاریخ بھی وہی ہوئی، جو اُس زمانہ میں خانہ کعبہ کے

لہ۔ مثنوی کے انگریزی شارحین ونفلڈ، جیمز، ریڈ ہاؤس، نکلسن، وغیرہم نے "بازگشتش" میں ضمیر چلپی رح کی طرف راجع کی ہے، اور معنی یہ لیے ہیں کہ جس دن وہ اپنی سیر سے لوٹے اسی دن مثنوی شروع ہوئی لیکن یہ صریحاً غلط ہے ضمیر خود مثنوی کی طرف ہے اور مراد یہ ہے کہ مثنوی کی بازگشت اسی روز شروع ہوئی جو روز استفتاح تھا۔

بلبلے زینجا برفت و باز گشت
بہر صید ان معانی باز گشت
ساعدشہ مسکنِ ایں باز باد
تا ابد بر خلق ایں در باز باد

درِ سعادت کے کھلنے اور لوگوں کے داخلہ کی تھی، یعنی رجب کی بندر ہوئیں[1]، اور اس دوکان علوم و معارف کے کھلنے کا سال ۶۶۲ھ ہے۔ حسام الدینؒ جب ناسوت سے ملکوت کی طرف گئے، تو ایک بلبل تھے، جب واپس آئے تو وہ بلبل، باز کی طرح، توی اور حقایق و معارف کا شکاری بن چکا تھا۔ مثنوی کا فیض انھیں سے جاری ہے، خدا کرے اس باز کا نشیمن ہمیشہ بازوئے شاہ رہے اور قیامت تک یہ درِ فیض کھلا رہے۔

مولاناؒ کا سال ولادت، عام تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق ۶۰۴ھ ہے اس حساب سے اس دفتر کے آغاز کے وقت آپ کا سن ۵۸ سال کا تھا۔

مثنوی کے مقاصد کی اس ضمنی توضیح کے معاً بعد یہ فرماتے ہیں کہ مثنوی سے استفادہ کی راہ میں جو

آفت ایں در ہوا و شہوت است
ورنہ اینجا شربت اندر شربت است

موانع ہیں وہ انسان کی اپنی ہوا و شہوت (خواہشاتِ نفس) ہیں، ورنہ یہاں تو جو کچھ ہے شربت ہی کی طرح لذیذ بھی ہے، اور مفرح و مسکن بھی۔

دفتر سوم کا بھی آغاز، دفتر دوم کی طرح حسام الدین چلپیؒ کے ذکر و خطاب، و منقبت سے ہوتا ہے

اے ضیاء الحق حسام الدیں بیار
ایں سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار
برکشا گنجینۂ اسرار را
در سوم دفتر بہل اعذار را

اس دفتر میں مثنوی کا ذکر سابق کے دونوں دفتروں سے نسبتہً زائد ہے عدد میں نہیں، اس لئے کہ ہے ایک ہی آدھ مقام پر، البتہ بسط و تفصیل میں کہیں زائد ایک عنوان ہے "باقی قصۂ مہمان آں مسجد مہمان کش"۔ اس کے تحت میں، شرح اسرار و کشفِ حقائق کرتے کرتے یک بیک رک جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں

ہیں دہاں بربند، فتنہ لب کشاد
خشک آر، اللہ اعلم بالرشاد

بس اب زبان بند کر لو، کہ فتنہ کی زبان کھل گئی ہے خاموش ہو رہو، بس اللہ ہی راہِ

---

[1] ازافادات حکیم الامت مولانا تھانوی مدظلہ۔

گفت وگو بسیار شد خامش شدم
مسئلہ تسلیم کردم، تن زدم

ہدایت کا علیم ہے۔ گفتگو بہت ہو چکی، تو میں خاموش ہو گیا، اور مسئلہ کو مان لیا۔

دشمن اور حاسد کس کے نہیں ہوتے؟ جب انبیاء کرام کے مقابلہ میں نمرود، فرعون، و ابوجہل پیدا ہوتے رہے، تو اولیا، الٰہی کیسے اس آزمایش سے بچتے۔ مثنوی کا پیرایۂ بیان عموماً حکایتوں کا ہے، بلکہ حکایت در حکایت کا۔ ایک ایک حکایت کے اندر خدا جانے کتنی حکایتیں اور روایتیں اور نکلتی چلی آتی ہیں۔ صاحب مثنوی کا کام کسی روایت یا حکایت کی تحقیق نہیں، نہ مورخانہ نہ محدثانہ، بلکہ ہر مشہور واقعہ سے صرف اپنا کام نکالنا، یعنی اس سے اخلاقی سبق پیدا کرنا، اور اسے اصلاح اعمال و تصحیح احوال و تزکیۂ باطن کا ذریعہ بنانا۔ کہیں کہیں مصطلحات تصوف سے بھی کام لیا گیا ہے، لیکن بہت کم۔ اور وہ مصطلحات ہجوم قصص و حکایات میں گم ہیں۔ سطح بیں عامی پڑھنے والے پر یہی اثر پڑتا ہے کہ کتاب، مسائل و حقایق کی نہیں، بلکہ قصہ کہانیوں کی ہے اور حاسدین نے اسی پہلو کو لے کر واہیات گوئی شروع کر دی۔ معاصرین کے علاوہ، ہو سکتا ہے کہ مولاناؒ کی چشم کشفی نے آئندہ کے بھی ایسے کم بیں معترضین کو دیکھ لیا ہو۔ بہر حال وہ ذکر ایسے ہی تہید ست مجحوبوں اور محروموں کا فرماتے ہیں، اور انداز بیان میں قدرتاً وہ حرارت بھی پیدا ہو گئی ہے جو ہر مشفق و خیر خواہ و دل سوز ناصح میں، نافہم و کج بیں مخاطبین سے سابقہ کے وقت پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش بیاں کرد آں حکیم غزنوی
بہر محجوباں مثالِ معنوی
کو ز قرآں گر نہ بیند غیر قال
ایں عجب نبود ز اصحاب ضلال
کز شعاع آفتاب پُر ز نور
غیر گرمی می نیابد چشمِ کور

حکیم غزنوی (سنائیؒ) نے کیسی اچھی مثال محجوبانِ معرفت کی بیان کی ہے کہ جو لوگ گم کردہ راہ ہیں، وہ اگر قرآن میں صرف قال ہی قال دیکھیں، اور معانی سے بےخبر رہیں تو اس میں تعجب کیا۔ جو آنکھوں کی بصارت سے محروم ہوتا ہے۔ اُس کی قسمت میں آفتاب جیسے منبع نور سے، بجز گرمی کے اور ہے کیا؟

حکیم سنائیؒ، صاحب حدیقہ، مولاناؒ کے پیش رو گزرے ہیں۔ مولاناؒ نے مثنوی اور غزلیات دونوں میں ان کا ذکر عزت و تعظیم کے ساتھ کیا ہے۔ ان کا مقولہ نقل کر کے اب خود فرماتے ہیں۔ ؎

خر بیطے ناگاہ از خرخانۂ
سر بروں آورد چوں طعانۂ
کیں سخن پست ست یعنی مثنوی
قصۂ پیغمبرست و پیروی
نیست ذکر بحث و اسرارِ بلند
کہ دوانند اولیا زاں سو سمند
از مقامات تبتل تا فنا
پایہ پایہ تا ملاقاتِ خدا
شرح جد ہر مقام منزلے
کہ بہ پر زو بر پرد صاحب دلے
جملہ سر تا سر فسانہ ست و فسوں
کودکانہ قصہ بیرون و دروں

اتنے میں ایک احمق نادان نے، گدھوں کے اصطبل سے، ایک لڑاکا بڑھیا کی طرح سر نکالا، اور کہنا شروع کیا کہ یہ مثنوی تو ایک پست کلام ہے، اس میں تو بس پیغمبروں کے قصے اور اُن کی پیروی کا بیان ہے اس میں نہ تو وہ اسرار دقائق ہیں جنکی طرف صوفیہ اپنے سمند توجہ کو دوڑائیں، نہ اس میں ترک و تبتل سے لیکر فنافی اللہ اور لقائے الٰہی تک، مقامات تصوف کی تشریح ہے اور نہ اسمیں مختلف مقامات و منازل سلوک کا بیان ہے، کہ کوئی صاحبدل اُدھر پرواز کرے۔ یہ تو سر تا سر بس قصہ کہانیاں ہیں، اور وہ بھی طفلانہ۔ ظاہر سے بھی اور باطن میں بھی۔

مولاناؒ فرماتے ہیں، کہ یہ تو خیر مثنوی ہی ہے بولہبیوں نے تو بعینہ اعتراض قرآن مجید پر کیا، اور کرتے رہے ؎

چوں کتاب اللہ بیامد ہم برآں
ایں چنیں طعنہ زدند آں کافراں
کہ اساطیر ست و افسانہ نژند
نیست تعمیقے و تحقیقے بلند

جب قرآن نازل ہوا، تو اس پر بھی کافروں نے یہی اعتراض کیا تھا کہ یہ تو اساطیر اولین ہے بڑی پرانی کہانیاں ہیں، اسمیں نہ کوئی بلند تحقیق ہے، نہ کوئی دقیق نکتہ دری۔

اس کے آگے دور تک اس اعتراض کی کافروں کی زبان سے تشریح و

وتوضیح چلی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک عنوان یہ قائم کیا ہے "تشبیہ صورتِ اولیاء و کلام اولیاء بصورت عصائے موسیٰ و صورت افسون عیسیٰ" اور اس کے تحت میں یہ مضمون درج ہے، کہ عصائے موسوی میں اس پر غور نہ کرو، کہ یہ لکڑی انہیں مل کہاں سے گئی اور کس طرح گئی تھی، یہ دیکھو کہ اس کے اثر سے سمندر شق ہو کر رہا۔ دمِ عیسوی میں دیکھنے کی چیز الفاظ و آواز اور اُن کی بلندی و پستی نہیں، دیکھنے کے قابل یہ ہے کہ اس سے مُردے زندہ ہو ہو کر رہتے تھے! اسی طرح کلام اولیائے الٰہی میں دیکھنے کے قابل اُن کا مغز ہوتا ہے، اُن کے معانی ہوتے ہیں، نہ کہ دوسری خارجی چیزیں۔

اس کے بعد کے کئی صفحات، متجانس بحثوں اور مثالوں کی نذر ہیں۔ پھر ایک حکایت ایک بچھڑے کی لکھی ہے، کہ ایک چشمہ کے کنارے بہت سے گھوڑے پانی پی رہے تھے، اسی جھنڈ میں وہ بچھڑا بھی تھا۔ کچھ دور کھڑے، چند سائیس زور زور سے للکار رہے تھے۔ بچھڑا ہر دفعہ اُن کی آوازوں کی ہیبت سے سر اُٹھا اٹھا لیتا۔ آخر ماں نے یہ دیکھ کر کہ بچھڑا پیاسا رہا جاتا ہے نہ رہا گیا، اور بولی، کہ بیٹے تو اپنے کام میں لگا رہ، ان آوازوں کی کچھ پروا نہ کر۔ یہ تو دنیا جب سے قائم ہوئی ہے، دراندازوں اور بیہودہ کاروں کا گروہ ہمیشہ سے اپنے شغل میں لگا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود کام بھی ہوتا ہی رہا ہے"۔ آگے مولانا فرماتے ہیں، کہ کلام اولیاء اسی چشمۂ خداوندی کے مانند ہے، اہلِ حق ہمیشہ اس سے سیراب و فیضیاب ہوتے چلے ہی آئے ہیں۔ کسی کو یقین نہ آئے، یا کوئی بے بصارت اس چشمہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتا ہو، تو تجربہ ہی کے لئے ٹٹول کر اپنے گھڑے کو اس چشمہ میں ڈال کر دیکھے اگر گھڑا بھر جائے اور اُسے وزنی محسوس ہونے لگے، جب تو یقین لائے۔ پس

ما چو آں کرّہ ہم آب جو خوریم
سوئے آں وسواسِ طاعن ننگریم

طالبانِ حق تشنگانِ معرفت، و شائقینِ مثنوی کی مثال اُس بچھڑے کی سی ہے انہیں طاعنوں کی پروا کیے بغیر، کلامِ اولیاء کے چشمۂ صافی و جاری سے بس اسی طرح بے کھٹکے استفادہ کرتے رہنا چاہیے۔

دفترِ چہارم کا آغاز، حسبِ معمول، حسام چلپیؒ ہی کی مدح وستائش سے ہوتا ہے، اور حسبِ توقع یہاں بھی مثنوی کو تمامتر انھیں کے فیضان توجہ کا ثمرہ بتایا گیا ہے

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
که گزشت از مه به نورت مثنوی

ہمت عالی تو اے مرتجے
می کشد ایں را خدا داند کجا

گردنِ ایں مثنوی را بستهٔ
می کشی آں سو که تو دانستهٔ

مثنوی پویاں، کشنده ناپدید
ناپدید از جاہلی کش نیست دید

مثنوی را چوں تو مبداء بودهٔ
گر فزوں گردد تواش افزودهٔ

چوں چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد حق آرزوئے متقیں

اسی قسم کا ذکر مسلسل کرتے کرتے، مثنوی کی حقیقت بیان کرنے میں صاحبِ مثنوی کی زبان یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے، کہ جو اسے حقیقت سمجھ کر پڑھے گا، اس کے لئے یہ حقیقت کا کام دے گی اور جو افسانہ سمجھے گا، اُس کے حق میں یہ افسانہ ہی رہیگی

ہر کش افسانه بخواند افسانه است
اب جو شخص اسے افسانہ سمجھ کر پڑھ رہا ہے

وانکه دیدش نقدِ خود مردانه است
تو بس اس کے حق میں یہ افسانہ ہی ہے

آبِ نیل ست و به قبطی خوں نمود
البتہ جو اس آئینہ میں اپنی صورتِ حال کا

قومِ موسیٰ را نه خوں بود آب بود
عکس دیکھ رہا ہے، اُس کا شمار مردانِ حق میں ہوگا۔ دریائے نیل دریا تھا، لیکن قبطیوں کو خون ہو کر نظر آیا موسویوں کے حق میں پانی ہی رہا۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ حسام چلپیؒ کو ایک روز کشف میں دکھایا گیا کہ مثنوی پڑھی جا رہی ہے اور لوگ ذوق وشوق عقیدت ونیاز کے ساتھ سُن رہے ہیں، اور وہ نور میں غرق ہیں، ساتھ ہی ملائکہ کی ایک جماعت، تلوار لئے کھڑی ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں بدعقیدگی مشاہدہ کرتے ہیں، اُن کے ایمان کے ریشوں اور رشتوں کو تلوار سے کاٹ رہی ہے، اور یہ بدنصیب، ایمان بُریدہ، منزلِ دوزخ کی طرف گرتے پڑتے جا رہے ہیں۔ مرید نے شیخ سے اپنا کشف بیان کیا، اور مولاناؒ نے اسکی

تصدیق کی۔ مثنوی میں اشعار بالا کے معاً بعد، اس ماجرے کا بھی بیان ہے ؎

دشمن ایں حرف ایں دم در نظر
شد ممثل سرنگوں اندر سقر
اے ضیاء الحق تو دیدی حالِ او
حق نمودت پاسخ افعالِ او
دیدۂ غیبت چو غیب ست اوستاد
کم مبادا زیں جہاں ایں دید وداد

مثنوی کے دشمنوں کی حالت، ابھی عالم مثال میں یوں مشاہدہ کرائی گئی کہ دوزخ میں سرنگوں پڑے ہیں۔ اے ضیاء الحق حسام الدین، اب تو تم نے خود ان منکرین کی حالت دیکھ لی، اور اللہ نے تمھیں ان کے اعمال کی سزا مشاہدہ کرادی

مبارک یہ چشم غیب بیں، جو غیب ہی کی طرح استاد ہے خدا کرے کہ اس کی بینش اور اور فیض رسانی میں کبھی کمی نہ آئے۔

چند حکایات کے بعد مولاناؒ کی توجہ پھر حضرت چلپیؒ کی طرف ہوتی ہے اور انکی مدح ومنقبت میں وہ وہ اشعار فرماتے ہیں، جو کسی مرید ومسترشد کے لئے کیا شیخ ومرشد کے لئے موجب فخر ہو سکتے ہیں۔ اور یہاں سے طریقت کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے، کہ افادہ ہمیشہ اور ہر حال میں شیخ ہی کی جانب سے طالب پر نہیں ہوتا، بلکہ کبھی طالب خود محرکِ فیض وداعی فیض ہو جاتا ہے اور اس لئے طالب کے بھی کچھ حقوق شیخ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہمچناں مقصود من زیں مثنوی
اے ضیاء الحق حسام الدیں توئی
مثنوی اندر اصول و ابتداء
جملہ بہر تست و بر تست انتہا
التجا بر تست و بر امدادِ تو
تکیہ بر اشفاق و بر اسعادِ تو
مثنوی اندر اصول و در فروع
می کند زیر لوائے تو رجوع
قصدم از الفاظ او راز تو است
قصدم از انشائش آواز تو است
پیش من آوازت آواز خدا ست
عاشق از معشوق حاشا کے جدا ست

مولاناؒ کی شاعری بھی قیامت کی ہے۔ خطرہ اس کا بھی تھا، کہ لوگ مثنوی کے جوش واثر کو کہیں محض شاعری کی سحر کاری نہ سمجھ لیں، اور مغز و مطالب ومعانی مثنوی کی طرف سے

غافل نہ ہو جائیں کہ گویا وہ بھی دوسرے شاعروں کے دیوان کی طرح ایک دیوان، اور ایک ادبی لطف و تفریح کی چیز ہے۔ اس دفتر میں ختم دفتر سے قبل پھر ایک بار مثنوی کے مغز و حقیقت پر توجہ دلاتے ہیں، اور فرماتے ہیں، کہ مثنوی کو استفادہ کے لئے پڑھنا چاہیئے اگر محض تفریح و وقت گزاری کے لئے پڑھتا ہے، تو ایسوں کیلئے کلام مجید اور شاہنامہ یا کلیلہ دمنہ (نعوذ باللہ) سب برابر ہیں۔

یا تو پنداری کہ حرف مثنوی
چوں بخوانی رایگانش بشنوی
یا کلام حکمت و سرِّ نہاں
اندر آید سہل در گوشِ کہاں
اندر آید لیک چوں افسانہا
پوست بنماید نہ مغز و دانہا
در سر و رو در کشیدہ چادرے
رو نہاں کردہ ز چشمت دلبرے
شاہنامہ یا کلیلہ پیش تو
ہمچناں باشد کہ قرآں از عتو
فرق آنگہ باشد از حق و مجاز
کہ کند کحل عنایت چشم باز
ورنہ پشک و مشک پیش اخشمے
ہر دو یکساں است چوں نبود شمے
خویشتن مشغول کردن از ملال
باشدش قصد از کلام ذوالجلال
کاتش وسواس را و غصہ را
زاں سخن بنشاند و سازد دوا

کیا تو یہ سمجھتا ہے، کہ مثنوی کے پڑھتے وقت تجھے کچھ توجہ نہیں خرچ کرنی ہے، یوں ہی خالی خولی اس کے الفاظ کو دہرا لینا ہے کیا کسی حکیمانہ کلام اور مسئلہ دقیق کیلئے ممکن ہے، کہ کوئی عامی اُسے سرسری طور پر پڑھ کر سمجھ لے؟ ہاں سمجھ تو لیگا لیکن کس طرح؟ بس جیسے قصہ کہانی کو سمجھتا ہے خالی پوست ہی پوست نصیب میں رہیگا اور مغز بالکل مخفی۔ محبوب کو دیکھے گا ضرور، لیکن اس طرح کہ چہرہ پر نگاہ نہ پڑیگی، چہرہ اور آنکھیں چادر سے چھپی ہوئی۔ اے سرکش، تیرے نزدیک تو جیسا قرآن، ویسا شاہنامہ یا کلیلہ دمنہ حقیقت و مجاز میں، اصل اور ملمع میں تو فرق اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے۔ جب سرمۂ عنایت بصیرت کو صاف کر چکا ہو! جس کے حاسۂ شم ہی نہیں، اس کے نزدیک غلیظ مینگنیاں، اور لطیف مشک دونوں یکساں! ایسوں کی نیت تلاوت

بہرِ ایں مقدار آتش شاندن
آب پاک و بول یکساں شد بفن

قرآن کے وقت کیا؟ بس محض دل بہلاؤ
کچھ اور نہ پڑھا قرآن ہی کھول لیا! ایسوں
کو جو قدر کلام الٰہی کی ہوگی، معلوم! جب مقصد محض یہ ٹھہرا، کہ کسی طرح تفریح حاصل کرنا اور افکار سے وقتی نجات پانا ہے تو آگ بجھانے کے لئے تو چاہے گندہ پیشاب ہو، اور چاہے لطیف آبِ خالص، دونوں یکساں!

دفتر پنجم، کہنا چاہئے کہ مثنوی کے ذکر سے خالی ہے۔ صرف آغاز میں، حسب معمول وہی ضمنی تذکرہ ہے۔ شیخ حسام چلپیؒ کی مدح و منقبت کے ذیل میں، اور اب کی شیخ کے اوصاف میں شاید پہلے دفتروں سے بھی کچھ زاید ہی گرمجوشی ہے ؎

شہ حسام الدیں کہ نورِ انجم ست / طالب آغاز سفر پنجم ست
اے ضیاء الحق حسام الدین راد / اوستادان صفا را اوستاد
گر نبودے خلق محجوب و کثیف / ور نبودے حلقہا تنگ و ضعیف
در مدیحت دادِ معنی دادمے / غیر ایں منطق لبے بکشادمے
مدح تو حیف ست با زندانیاں / گویم اندر مجمع روحانیاں
شرح تو غبن ست با اہل جہاں / ہمچو رازِ عشق دارم در نہاں

البتہ خاتمہ کے قریب ایک بار مختصراً مثنوی کی معنویت اور اس سے طریق استفادہ کا بیان آگیا ہے۔ ؎

از صحائف مثنوی ایں پنجم ست
در بروج چرخ جاں چوں انجم ست
رہ نیابد از ستارہ ہر حواس
جز کہ کشتیبان استارہ شناس
جز نظارہ نیست قسم دیگراں
از سعودش غافل اند و ز قرآں
آشنائی گیر شبہا تا بروز

سلسلہ مثنوی کا یہ پانچواں صحیفہ ہے۔ آسمانِ روحانیت میں مثنوی مثل بروج انجم کے ہے لیکن ستاروں کی شناخت، اور اُن کے ذریعہ سے راہ یابی، ہر عامی ہر حواس مادی رکھنے والے کا کام نہیں، ستاروں سے راہ تو صرف جہازراں و ملاح پاتے ہیں، کہ وہی اُن کی چالوں سے

باچنیں استارہائے دیوسوز | اُن کی برکتوں سے واقف ہوتے ہیں،

اور وہی ہر وقت انھیں دیکھتے اور پہچانتے رہتے ہیں۔ دوسرے لوگ تو بس دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ آسمانِ روحانیت کے یہ ستارے، شہاب ثاقب کا کام دیتے ہیں، شیطان کو دور ہی سے بھگانے والے، یوں تو ستاروں کو پہچاننا اور اُن سے فائدہ اٹھانا ہے تو راتوں کو جاگ جاگ کر اُن سے اُنس و شناسائی پیدا کر۔

دفتر ششم، مثنوی کا آخری دفتر ہے، اور اسی میں مثنوی کا تعارف سب سے زائد ہے۔ عدد کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ بعض اہل طریق نے کہا ہے کہ کشف اسرار و شرح مسائل کے لحاظ سے دفتر ششم سابق کے پانچوں دفتروں سے بڑھا ہوا ہے۔ مثنوی کے تعارف میں یہ بسط و اطناب بھی، ممکن ہے اسی کا اقتضا ہو، آغازِ دفتر، حسب دستور مرید محبوب، حضرت چلپی رح کی مدح سرائیوں سے ہے ؎

اے حیاتِ دل حسام الدیں بسے | میل می جوشد بہ قسم سادسے
گشت از جذب تو چوں علامہ | درجہاں گرداں حسامی نامہ
پیش کش بہر رضایت می کشم | در تمام مثنوی قسم ششم
پیش کش می آرمت اے معنوی | قسم سادس در تمام مثنوی
شش جہت را نور دہ زیں شش صحف | کے یطوف حولہ من لم یطف
بوکہ فی ما بعد دستوری رسد | رازہائے گفتنی گفتہ شود

شروع ہی کے چند صفحوں کے بعد مثنوی کی حقیقت اس دفتر میں یوں بیان ہوتی ہے ؎

گر شدی عطشان بحر معنوی | اگر تو بحر معنوی کا پیاسا ہے، طالب شرح
فرجہ کن در جزیرہ مثنوی | مسائل ہے، تو مثنوی کے جزیرہ میں سیر کر
فرجہ کن چنداں کہ اندر ہر نفس | الفاظ مثنوی میں فکر و تدبر سے کام لے۔ اور

مثنوی را معنوی بینی و بس | سیر اس جزیرہ میں ایسی کر، کہ ہر لمحہ

مثنوی بس معنوی ہی دکھائی دینے لگے، التفات بجائے لفظ عبادت کے بس معانی ہی معانی پر رہ جائے لہ

مثنوی کا مشہور و معروف لقب "مثنوی معنوی" ہے۔ صاحب مثنوی خود، سب سے زیادہ، اور بار بار زور اسی وصف معنویت پر دیتے ہیں۔ چنانچہ چند صفحوں کے بعد پھر خطاب، حسام چلپیؒ سے شروع ہوتا ہے اور اس ضمن میں مثنوی کی معنویت پر پھر روشنی پڑ جاتی ہے ؎

اے ضیاء الحق حسام الدیں بیا
اے صقالِ روح و سلطان ہُدیٰ
مثنوی را مسرح مشروح دہ
صورتِ امثال او را روح دہ
تا حروفش جملہ عقل و جاں شوند
سوئے خلدستان جاں پرّاں شوند
ہم بہ سعی تو ز ارواح آمدند
سوئے دامِ حرف مستحقن شدند

اے ضیاء الحق حسام الدین، اے روح کے صیقل گر، اے سلطان ہدایت، اب ادھر متوجہ ہو، مثنوی کو اپنے فیض سے میدان وسعت مرحمت کر، کہ خوب تفصیل سے بیان حقایق ہو، اور الفاظ حکایات کے اندر معانی کی روح ڈال دے، تاکہ اُس کے الفاظ و عبارات سرتاسر علوم و حقائق بن جائیں۔ اور عالم معانی و جہان حقائق ہی کی طرف پرّاں ہو جائیں۔ اب تک جتنے معانی کا القا ہوا ہے، وہ تیرے ہی فیوض سے ہوا ہے اور دام الفاظ میں اگر وہ قید ہو گئے ہیں۔

آگے چل کر، حدیث لارہبانیۃ فی الاسلام سے متعلق ایک "مناظرۂ مرغ اور صیاد درج کیا ہے، اس حکایت کی تفصیلات لکھتے لکھتے ایک جگہ اپنے نفس نفیس کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ ؎

مثنوی را چابک و دلخواہ کن
ماجرا را موجز و کوتاہ کن

بس اس حکایت کو مختصر کر کے قصہ پورا کرو اور مثنوی کو آگے چلتا ہوا کرو۔ اور جب

لہ۔ "اور یہ بات غایت مراقبہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔" (حکیم الامت مدظلہ)

مرضی بناؤ۔

اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقصود بیان حکایات اور اُن میں تطویل نہیں، بلکہ محض اُن سے استنباط نتائج وافادۂ خلق۔ مثنوی کے بعض مضامین، مخالفِ احکام شریعت معلوم ہوتے ہیں، جو صریح گمراہی ہے لیکن یہ دھوکا صرف الفاظ ظاہری سے ہو سکتا ہے، اگر تحقیق معانی کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ مخالفت بالکل رفع ہو جاتی ہے، عین توافق نظر آنے لگتا ہے، جو ہدایت کے مترادف ہے اسے مولاناؒ یوں بیان فرماتے ہیں، اور اس کی شرح بھی بہترین وہ ہے، جو مولانا تھانوی مدظلہٗ نے کی ہے ؎

بس ز نقش لفظہائے مثنوی	نقوش مثنوی کے جو الفاظ ہیں وہ نرے
صورتش ضال ست وہادی معنوی	الفاظ تو گمراہ و گمراہ کن ہو سکتے ہیں لیکن یا

معانی کے ساتھ انھیں ملا کر دیکھو، تو گویا وہ خود ہادی اور حقایق کی طرف رہبر ہیں "یعنی ان الفاظ کو بلا تحقیق معانی مراد کے دیکھا جائے تو بہت مقامات پر خلاف قواعد شرعیہ نظر آویں گے، اور مع تحقیق معانی مراد دیکھا جاوے تو بالکل موافق قواعد شرعیہ نظر آویں گے"۔ (کلید مثنوی)

مثنوی کا مقصود حقیقی اور موضوع اصلی، توحید ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ محض ضمناً و تبعاً ہے۔ مثنوی اول سے آخر تک اسی تذکرہ سے لبریز ہے، اور خود اس حقیقت کی تصریح مولاناؒ بار بار کرتے جاتے ہیں۔ اس دفتر میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہر دکانے راست سودائے دگر	ہر دکان کا سودا الگ ہوا کرتا ہے، وہاں
مثنوی دکان فقر ست اے پسر	اصلاً وہی شے ہوتی ہے۔ ہماری مثنوی،
در دکان کفشگر چرم ست خوب	فقر کی دوکان ہے، یہاں بجز توحید
قالب کفش ست اگر بینی تو چوب	کے اور کیا ہے۔ موچی کی دوکان پر چمڑا ہی
پیش قزاقاں خز ادکن بود	چمڑا ہوتا ہے، اگر لکڑی بھی ہے، تو چمڑے کی

بہر گز باشد اگر آہن بود
مثنویِ ما دکانِ وحدت ست
غیرِ واحد ہر چہ آں بینی بت ست

ماتحت، جوتی کے قالب کی حیثیت سے۔ ریشم فروشوں کی دکان پر ریشم سیاہ ہی کے ڈھیر ہوں گے۔ اگر لوہا ہوگا بھی تو اُسی کی پیمائش کے لئے۔ اسی طرح ہماری مثنوی، توحید کی دکان ہے، یہاں تو مقصود بس توحید ہی توحید ہے اس کے علاوہ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ بمنزلہ بُت کے ہے۔

قریب نصف دفتر کے پہنچ کر مضامین عالیہ مسلسل بیان کرتے کرتے، ایک جوش سا آجاتا ہے، اور اسی جوش کے عالم میں ایک بار پھر حقیقت مثنوی سے نقاب اُٹھ کر رہتا ہے ؎

گر شود بیشہ قلم دریا مِدید
مثنوی را نیست پایانے امید
چار چوب خشت زن تا خاک ہست
می دہد تقطیع شعرش نیز دست
چوں نماند خاک و بادش حف کند
خاک سازد بحرا و چوں کف کند
چوں نماند بیشہا سر در کشند
بیشہا از عین دریا سر کشند

اگر جنگل کے جنگل کٹ کر قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی[1]، جب بھی بیانِ مثنوی ختم و منقطع نہیں ہونے کا، کہ یہ معرفت الٰہی کا بیان ہے اور معرفت الٰہی کا بیان کبھی بھی ختم ہو سکتا ہے؟ اینٹ کا سانچہ اینٹ کے وجود تک دنیا میں رہیگا، اسی طرح اشعار مثنوی کی تقطیع بھی رہتی دنیا تک موجود رہے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب یہ عالم نہ باقی رہے گا، اور ہوائے تند اس خاک کو نابود کردے گی تو اس مثنوی کا دریا جوش زن ہو کر ایک دوسرا عالم تیار کردے گا، اور جب یہ بیشے پردۂ عدم میں روپوش ہو جائیں گے تو دوسرے بیشے اُس عالم کے دریا سے نمودار ہو کر رہیں گے۔

سچوں کی زبان سے، حق تعالیٰ ہمیشہ سچ ہی نکلواتا ہے۔ کس جوش و خروش کے عالم میں پیش گوئی کی ہے، کہ مضامین مثنوی کے برکات، اور معانی مثنوی کے

---

[1] تلمیح جانب آیۂ کریمۂ ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ۔

فیوض تو غیر منقطع ہیں ہی (کہ یہ کلمات الٰہی ہیں اور کلمات الٰہی غیر محدود لامتناہی ہیں) مثنوی کے الفاظ و اشعار تک زبانوں پر قیامت تک محفوظ رہجائیں گے اور برابر سینوں سے سفینوں میں منتقل ہوتے رہیں گے پیشگوئی کو آج سات سو سال ہو چکے، کتنے مصنف، کتنے شاعر، کتنے ادیب، کتنے انشاء پرداز کتنے اہل قلم اس مدت میں اٹھے اور چند روز کی چمک دمک کے بعد ایسا غائب ہوئے کہ کتابوں کے بوسیدہ اوراق تک میں ان کا پتہ نہیں! اور ایک مثنوی ہے کہ اتنی مدت گزرنے پر (سات سو سال کی مدت کچھ کم ہوتی ہے! ذرا خیال کر کے دیکھا جائے) نئے نئے اڈیشن نکلتے چلے آ رہے ہیں شرحوں پر شرحیں لکھی جارہی ہیں، ترجموں پر ترجمے ہو رہے ہیں۔ ہندوستان و ایران، مصر و افغانستان، پنجاب و دکن، سندھ و توران، جرمنی و فرانس، برطانیہ و امریکہ کوئی بھی سرزمین ایسی نہیں جہاں مثنوی اپنا گھر نہ کر چکی ہو۔ خدا جانے کتنی جگہ زیر درس ہے اور خدا جانے کتنے اسی کے سہارے سلوک و مجاہدہ کی منزلیں طے کر چکے اور طے کر رہے ہیں اور جب یہ سب عین مشاہدہ ہے تو پیشگوئی کے اس جزو کی تصدیق میں کیا، اور کیسے تامل ہو سکتا ہے کہ آج کے بعد 'کل' جزائے اعمال کے وقت 'دارِ آخرت کے ظہور کے وقت بھی' اس کلام شریف کی برکت اور نورانیت پوری طرح تجلی افگن ہو کر رہے گی۔

جاوید نامہ

خالق کی "سب سے زیادہ تعریف کرنے والے" کا نام صدیقوں اور نورانیوں نے ہمیشہ جن جن القاب کے ساتھ لیا۔ وہ ہم اور آپ بارہا سُن چکے، مخلوق کے "سب سے زیادہ تعریف کیے گئے" کا ذکر، شہیدوں اور ولیوں کی زبان پر جس جس طریقہ پر آیا، اُس سے بھی خوب واقفیت ہو چکی، لیکن یہ بھی کچھ خبر ہے کہ اس "احمد" اور "محمد" کے وقت اور زمانہ کے صدیق نہیں، زندیق اور نورانی نہیں، ظلمانی، اسے دیکھ دیکھ کیا کہتے تھے اور اس کے جلو میں حق کی تائیدیں اور نصرتیں ہر دم دیکھ دیکھ، آخر اپنے دل کی جلن اور کلیجہ کی پھنکن کیا کہہ کہہ کر ٹھنڈی کرتے تھے؟ زمانہ کا سب سے بڑا "روشن خیال" اور جمہوریۂ قریش کا سب سے بڑا لیڈر، ابوجہل، جاتا ہے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو، شاید غلاف کعبہ کو تھام کر یوں "صدائے احتجاج" بلند کرتا ہے۔ ؎

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ ‏ ‏ ‏ از دم او کعبہ را گل شد چراغ

از ہلاک قیصر و کسریٰ سرود ‏ ‏ ‏ نوجواناں را ز دست ما ربود

ساحر و اندر کلامش ساحری ست ‏ ‏ ‏ ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری ست

تا بساطِ دینِ آبا در نورد ‏ ‏ ‏ با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

پاش پاش از ضربتش لات و منات ‏ ‏ ‏ انتقام از وے بگیر اے کائنات

دل بغائب بست و از حاضر گسست ‏ ‏ ‏ نقشِ حاضر را فسونِ او شکست

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست ‏ ‏ ‏ آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات ‏ ‏ ‏ بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلات

اس محمد کی تحریک نے تو ہمارے دلوں کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ہمارے کعبہ کی رونق اس نے غائب کر دی! قیصر و کسریٰ کے مٹانے کے خواب دکھا دکھا کر، ہائے خود ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا! کیسا زبردست ساحر ہے، اور کلام تو سراپا سحر! اب اس سے بڑھ کر کفر صریح اور کیا ہوگا کہ اپنے دین کا کلمہ ہی لا الٰہ الا اللہ قرار دیدیا ہے! جس دین کو ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے مانتے چلے آئے، اسی کو جھٹلا کر رکھ دیا ہے، اور ہمارے معبودوں کی توہین کی تو حد کر دی۔ ہمارے "لات" ہمارے "منات" کسی کو بھی تو نہیں چھوڑا اور یہ اندھیر کہ اب بھی اُس سے انتقام نہیں لیا جاتا! پھر یہ عقیدہ بھی تو ملاحظہ ہو، کہ "آج" کو چھوڑ دو "کل" کو پکڑو! "حاضر" کچھ نہیں "غیب" ہی سب کچھ! نقد کو چھوڑ، وعدہ کے پیچھے دوڑنا محسوسات کو چھوڑ ایک عالم غیب کے چکر میں پڑے رہنا، یہ آخر کہاں کی عقل ہے؟ جن معبودوں کو ہمیشہ ہم نے پوجا، ہماری State نے پوجا انہیں چھوڑ چھاڑ، ایک ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانے کے آخر معنی کیا؟

معصوم کی فردِ جرم کے عنوانات (نعوذ باللہ) اس موذی کی زبان سے ابھی ختم کہاں ہوئے آگے اور سُنیے:-

مذہب او قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدر احرار عرب نشناختہ — با کلفتان حبش در ساختہ
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب میدانم کہ سلماں مزدکی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است
چشم خاصانِ عرب گردیدہ کور — بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور
اے تو مارا اندریں صحرا دلیل — بشکن افسون نوائے جبرئیل
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
اے منات اے لات ازیں منزل مرو — گر ز منزل می روی از دل مرو

اس کا مذہب، غضب ہے غضب کہ نہ ملک و زمین کی پروا کرتا ہے، نہ خاندان

ونسب کی۔ کہاں کی قومی عصبیت اور قومیت، یہ تو عرب اور غیر عرب قریش وغیر قریش سب کو سطح پر کئے ڈالتا ہے اندھیر ہے اندھیر، کہ مساوات کا نام لے کر غلام اور آقا کو ایک دستر خوان پر بٹھائے رہتا ہے! ہائے دل کو کیسے صبر آئے عرب کی بے عزتی ہو، اور حبشہ کے کالے کلوٹوں کی عزت و قدر! یہ "مساوات" یہ "مواخات" ہمارے ہاں تھی کب؟ یہ سب اُسی سلمان فارسی کی لائی اور سکھائی ہوئی ہے! ہمارا بھتیجا، ابن عبداللہ اسی مزدکی کے کہے سنے میں آکر، آہ، کیسا اپنے ملک و ملت کا دشمن ہوگیا ہے! اچھے اچھے اشرافِ عرب اُس کے افسوں میں آکر بہک چلے، اے زہیر، اے سحبان، اے امراء القیس، تم کہاں ہو اپنی قوم کی بربادی دیکھ رہے ہو، اور پھر اپنی قبروں سے باہر نکلکر نہیں آتے؟ جبریل کے لائے ہوئے پیام کا، اس کے پھیلائے ہوئے جادو کا توڑ اگر ہے تو تمھاری فصاحت و بلاغت میں، تمھاری ہی سحر کاری اور شاعری میں! اے اچھے اور بڑے دیوتا، ہبل، تمھیں کیا ہوگیا، اپنے پجاریوں کی تم بھی خبر نہیں لیتے۔ بے دینوں کو آخر کب تک مہلت دیے جاؤ گے؟ اے پیاری دیویو، لات اور منات کہیں یہ غضب نہ کرنا کہ ہم سے روٹھ کر چلی جاؤ۔ اور خیر اگر جانا ہے، تو تمھیں تمھارا ہی واسطہ کہیں ہمارے دل کی آبادیوں کو اپنی یاد سے ویران نہ کر دینا۔

شاعر کی آواز، الہام کی آواز ہوتی ہے۔ ہاں ہر شاعر کی نہیں، اس شاعر کی نہیں جو بے بصری کے ساتھ تخئیل کی ہر وادی میں ٹھوکریں کھاتا، اور اپنا سر ٹکراتا پھرتا ہے، بلکہ اُس شاعر کی، جو ایمان کی روشنی میں، بصیرت کی شعاعوں میں، وَانتصروا مِنۢ بَعدِ مَا ظُلِمُوا کے سایۂ رحمت میں، حقیقت کی منزلیں طے کرتا ہوتا ہے۔ اقبال، قوم میں، اسی قسم کا شاعر ہے۔ اقبال کے نام سے خیال مسلم کانفرنس اور گول میز کانفرنس اور سیاسیات کی طرف نہ جائے۔ یہاں ذکر سیاسی اقبال کا نہیں، اقبال شاعر کا ہے۔ اُس اقبال کا جس نے "قومی ترانہ" گایا، اُمت کا "شکوہ" اپنے رب کو سنایا اسرارِ خودی کی تشریح کی، "رموزِ بیخودی" کو بے نقاب کیا، اور مغرب اور مغرب زدوں تک "پیامِ مشرق"

پہنچایا۔ اور اب اپنی روئدادِ دل کو جاوید نامہ کے نام سے پیش کرنے اٹھا ہے۔

یہ نئے طرز کی نعت، اسی اقبال کی زبان سے ابھی آپ نے سنی۔ "نعت" ایسی انوکھی نعت کبھی کیوں کسی نے کہی ہو گی، لفظاً ہجو اور معناً نعت ہی نعت! ایسی نعت کی سند اگر ملتی ہے، تو بندوں سے گزر لیے، خود اللہ کے کلام میں! نوحؑ اور ابراہیمؑ، لوطؑ اور صالحؑ، شعیبؑ اور یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ، اور سب سے بڑھ کر خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ، ظالموں اور طاغیوں نے جو گستاخیاں کیں، قرآن پاک نے آخر انہیں نقل ہی کر کے محفوظ کر دیا۔ یہ سب انبیائے کرام کی نعت نہیں تو اور کیا ہے؟ خفاش (چمگادڑ) اگر شور مچا مچا کر کہے کہ یہ دن کیسا تیرہ و تار ہے، کہ مجھے ذرا بھی نہیں سجھائی دیتا، تو یہ انسانوں کے لئے دلیل اس کی ہوئی کہ دن تاریک نہیں، خوب روشن ہے۔ اشقیا اگر کسی کو جی بھر بھر کر کوسیں، تو یہ اس کی ہجو نہیں اس میں مدح ہوئی۔ پیکرِ ظلمت وضلالت کی زبان سے سرچشمۂ نور وہدیٰ کے لئے سب وشتم، نعت کی وہ لطیف قسم ہے کہ دوسروں کا ذہن بھی یہاں تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔

جاوید نامہ کی زبان فارسی ہے، عارف رومی کی زبان، اور بہت سے دوسرے محرمانِ اسرار کی زبان۔ کتاب خود ایک مثنوی ہے، جا بجا غزلیات سے آراستہ۔ خاکہ مثنوی یہ ہے کہ شاعر شہر کے ہجوم وہنگامہ سے گھبرا کر دریا کے کنارے چلا گیا ہے، تنہائی میں ایک روز سرِ شام رومیؒ کی یہ غزل جس کا مطلع ہے۔ ؎

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزو است
بنمائے رُخ کہ باغ وگلستانم آرزو است

گنگنا رہا تھا کہ مولاناؒ کی روحانیت دفعۃً منکشف ہوئی۔ اس روح کا مادی سراپا بھی ملاحظہ ہو جائے۔ ؎

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب — شیب او فرخندہ چوں عہدِ شباب
پیکرے روشن ز نورِ سرمدی — در سراپایش سرورِ سرمدی
بر لب او سرِّ پنہانِ وجود — بند ہائے حرف وصوت از خود کشود

حرف او آئینہ آویختہ   علم با سوزِ دروں آمیختہ

ایسا موقع مل کر کہاں ہاتھ سے دیا جاسکتا تھا، گفت و شنود، سوال و جواب سب ہو لئے۔ اب فرشتہ زردان متمثل ہوتا ہے، جو روح زمان و مکان ہے، اور اس کی رہنمائی میں شاعر عالم ملکوت کی سیاحت کو روانہ ہوتا ہے۔ پیر رومیؒ قدم قدم پر دستگیری کو موجود۔ اس عالم میں شاعر کی نظر سے جو جو منظر گزرتے ہیں اُن کی وہ فوری عکسی تصویر Snap shot لیتا جاتا ہے، اور انہیں منظروں کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کررہا ہے۔ اعلیٰ علیین اور اسفل السافلین دونوں کسی کی تجلیات جمالی و قہری کی جلوہ گاہ دونوں کی حیات ابدی۔ ایک سرے پر موسیٰ کلیمؑ، دوسرے پر فرعون۔ حیات جاودانی کے حصہ دار دونوں اپنے اپنے رنگ میں! مرقع کو شاعر جاوید نامہ کہہ کر نہ پکارتا، تو اور کیا کہتا؟

نوحۂ ابو جہل، ابھی آپ سُن چکے۔ اب ذرا نالۂ فرعون بھی، عبرت کے کانوں سے سنتے چلئے۔ فرعون جہاں ہے اُس مقام کی ویرانی کا کیا پوچھنا۔ ؎

کوہ ہائے شستہ و عریان و سرد   اندراں سرگشتہ و حیراں دو مرد

وہ مقام ہے ہی مخصوص زور آوروں، منکروں، گردن کشوں، غیب کے منکروں اور حواس پرستوں کے لئے۔ مولانا کی روحانیت ساتھ ساتھ ہے پتہ بتاتی ہے کہ

ایں مقام سرکشانِ زور زیست   منکرانِ غائب و حاضر پرست

لیکن فرعون یہاں تنہا نہیں ہے، ایک دوسرا فرعونِ وقت بھی اس پچھلے فرعون کے ہمنشین و ہم پہلو ہے۔ وہ فرعون مصری ہزارہا سال قبل کا تھا، یہ فرعون اسی بیسویں صدی کا ہے۔ ملک مصر، کا اور' دریا، کا تعلق دونوں سے، ایک شرقی، ایک غربی۔ ایک، ایک پیمبر کے مقابلہ میں اکڑنے والا، دوسرا ایک درویش کو ستانیوالا عدو اللہ دونوں کے دونوں۔ انجام کی عبرت انگیزی کے لحاظ سے دونوں ایک۔ انتہائی ساز و سامان کے باوجود، دریا میں ڈوب کر ہلاک ہونے والے دونوں! ؎

آں یکے از شرق واں دیگر زغرب — ہر دو با مردانِ حق در حرب و ضرب
آں یکے بر گردنش چوبِ کلیم — واں دگر از تیغ درویشے دونیم
ہر دو فرعون، ایں صغیر و آں کبیر — ہر دو در آغوش دریا تشنہ میر
ہر کسے با تلخیِ مرگ آشناست — مرگ جباراں ز آیاتِ خداست

مولانا کی نورانیت سے، فضا کی تیرگی وقتی طور پر منور ہو جاتی ہے، اور مملکت ظلمات کا تاجدار حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ اس ظلمت کدہ میں یہ روشنی کی شعاعیں کہاں سے!

گفت فرعون، ایں سحر، ایں جوئے نور — از کجا ایں صبح و ایں نور و ظہور!

مولانا فرماتے ہیں۔ اے یدِ بیضا کے منکر، آج تو اس نور کا اقرار کرنا پڑا! فرعون باساماں کی آہ و زاری، اُن کے سننے کے قابل ہے جو آج فرعون بے ساماں بنے ہوئے ہیں۔

آہ نقدِ عقل و دیں در باختم — دیدم و ایں نور را نشناختم
اے جہانداراں سوئے من بنگرید — اے زیاکاراں سوئے من بنگرید
وائے قومے از ہوس گر دیدہ کور — می برد لعل و گہر از خاکِ گور
پیکرے کو در عجائب خانہ ایست — بر لبِ خاموش او افسانہ ایست
از ملوکیت خبر ہا میدہد — کور چشماں را نظر ہا میدہد

ہائے افسوس کہ میں زندگی بھر عقل اور دین دونوں سے محروم رہا۔ ہیہات، کہ آنکھوں کے سامنے روشنی رہی، اور مجھ بدبخت نے اُسے نہ دیکھا۔ دنیا کے تاجدارو، نشۂ غفلت کے متوالو، میری مثال سے عبرت حاصل کرو۔ نصیحت پکڑو۔ عبرت، عبرت، کہ اب دنیا میں ایسی قوم پیدا ہوئی ہے، حرص و ہوس میں اندھا دھند غرق، جو دولت بٹورنے کی دھن میں مقبروں تک کو کھود ڈالتی ہے، اور مدفون سلاطین کی لاشوں سے لعل و جواہر اُتار رہی ہے! میرے جسم کو انہوں نے نکال کر عجائب خانہ میں رکھا ہے، حالانکہ وہ خود ایک خاموش وعظ کہہ رہا ہے، بادشاہوں کا انجام یہ ہوتا ہے! عبرت کی آنکھ رکھنے والو، میرے انجام سے عبرت و نصیحت حاصل کرو!

سارا تمرد، ساری شیخی، ساری گردن کشی، بس زندگی بھر تھی، اب آرزو اور التجا ہے

تو یہ ہے۔ ؎

بازگر بینم کلیم اللہ را — خواہم از وے یک دلِ آگاہ را

کاش اب پھر کلیم اللہ کی زیارت نصیب ہوتی، اب جو وہ ملتے تو اب اُن سے نورِ ایمان ہی کو طلب کرتا!

بیسویں صدی کے فرعون کو آپ نے پہچانا؟ یہ وہ "ذوالخرطوم" ہے جسے دورِ جدید کے فرعونوں نے لارڈ کچنر آف خرطوم کہہ کر پکارا، مہدی سوڈانی کی قبر کو کھود ڈالنے والا اور خود اپنے انتہائی عروج کے وقت، سمندر میں اس طرح غرق ہو کر رہنے والا، کہ لاش کا بھی آج تک پتہ نہ چلا۔ اس بڑے فرعون سے، وہ مصر کا چھوٹا فرعون پوچھتا ہے، اور اس انداز سے پوچھتا ہے کہ آس پاس کے سننے والوں کے دل بھی عبرت سے ہل جاتے ہیں۔ ؎

قبرِ ما را علم و حکمت برکشود — لیک اندر تربتِ مہدی چہ بود

میرے مقبرہ کو تو تم لوگوں نے "علمی تحقیقات" کا نام لے کر کھودا، لیکن ظالم یہ تو بتا کہ غریب مہدی سوڈانی کی قبر کھود ڈالنے سے تجھے کون سی اثری تفتیش اور علمی تحقیق مقصود تھی؟

معاً جنت کی خوشبوؤں کی لپیٹیں آنے لگتی ہیں! اور اُن میں بسی ہوئی سوڈان کے مظلوم درویش کی روح، برق کی طرح چمکتی اور جگمگاتی متمثل ہو جاتی ہے اور ظالم کو سنا کر کہتی ہے۔ ؎

گفت اے کشنر اگر داری نظر — انتقامِ خاکِ درویشے نگر

آسماں خاکِ ترا گورے نداد — مرقدے جز در یمِ شورے نداد

اے بصارت سے محروم کچنر اب تو تو نے اپنا بھی انجام دیکھ لیا! ایک بے بس درویش کا انتقام، تجھ قدرت والے اور حکومت والے سے کیسا لیا جا کر رہا! تو نے قبر سے نکال کر کسی کے جسم کو بے حرمت کیا تھا، نتیجہ دیکھا کہ تیرے لاشہ کے قبول

کرنے سے سطحِ زمین کے چپہ چپہ نے انکار کر دیا! اور آخر تجھے جگہ ملی، تو شور سمندر کی تہ میں!

اس کے بعد اس مجاہد کی روح قلب کے سوز اور سینہ کے گداز کے ساتھ یوں مناجات میں لگ جاتی ہے۔

گفت اے روحِ عرب بیدار شو   چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو

اے فواد، اے فیصل، اے ابنِ سعود   تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت   در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت

خاکِ بطحا، خالدِ دیگر بزائے   نغمۂ توحید را دیگر سرائے

اے نخیلِ دشت تو بالندہ تر   بر نہ خیزد از تو فاروقے دگر

اے جہانِ مومنانِ مشک فام   از تو می آید مرا بوئے دوام

زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر   تا کجا تقدیر تو در دستِ غیر

بر مقامِ خود نیائی تا بہ کے   استخوانم در پئے نالد چو نَے

اے عرب کی روح! تو کیوں نہیں بیدار ہوتی اور کیوں نہیں اپنے وہ کارنامے دکھاتی، جو تیرے اسلاف چھوڑ گئے ہیں۔ اے مصر کے، عراق کے، حجاز کے بادشاہو، کب تک بس اپنی نفسی نفسی میں پڑے رہو گے! اٹھو، اور اپنے دلوں میں وہ سوز پیدا کرو، جو آخر کبھی تو رہ چکا ہے، اٹھو اور ہمت کرو، کہ عظمت کے گزرے ہوئے دن پھر واپس آجائیں! اے خاکِ مکہ، کاش تو ہی کسی دوسرے خالد جانباز کو از سرِ نو پیدا کر، اور دنیا کو ایک بار پھر توحید کا ترانہ سنا دے! اے سرزمین پاک (اللہ تیرے ریگستان کے کھجوروں میں برکت دے) کیا اب تجھ میں کوئی دوسرا فاروق اعظم نہ پیدا ہوگا؟ اے حبشہ کے پیارے باشندو، مشک کی سی صورت اور رنگ رکھنے والو، تم مجھے کس قدر محبوب ہو! لیکن ہمت اور عزم و ولولہ کے بغیر زندگی کا لطف کیا؟ وہ زندگی ہی کیا، جو غیر کی محکومی میں ہو! اللہ وہ دن کب لائے گا، جب تمھیں تمھارے اصلی مقام پہ فائز دیکھوں میری ہڈی ہڈی سے دعا نکل رہی ہے، تو یہی!

سیاسی مخالفوں نے اقبال کو طرح طرح بدنام کیا ہے اور "ٹوڈی" اور سرکار پرست

اور غدار ملت اور خدا معلوم اور کیا کیا خطابات عطا کر رکھے ہیں لیکن اقبال کے جو اصلی خیالات ہیں وہ خود انھیں کی زبان سے ملاحظہ ہوں۔

مرشد آباد (بنگال) کے میر جعفر اور میسور (دکن) کے مشہور شیر دل فرماں روا ٹیپو سلطان کے زمانہ کے میر صادق علی سے، تاریخ کا کون طالب علم ناواقف ہے؟ ہندوستان میں انگریزوں کا قدم جمانے کے خاص اسباب، انھیں دونوں بزرگواروں کی کارگزاریاں ہوئی ہیں ——— کم از کم اقبال کا تاریخی مطالعہ انھیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے ——— اقبال ان دونوں کو اپنی سیر سماوی میں دیکھتے ہیں ؎

جعفر از بنگال، و صادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دیں، ننگِ وطن

مگر کہاں؟ کیا جنت میں؟ جنت میں نہ سہی، اعراف میں؟ نہیں، دوزخ میں بھی نہیں! دوزخ بھی ایسے ارواحِ رذیلہ سے پناہ مانگتا، اور انھیں اپنے اندر لینے سے انکار کر رہا ہے! ایک عالم انتہا درجہ کا مہیب و زہرہ شکن روبرو ہے، مردودیت و مقہوریت کے سارے آثار سے لبریز، تیرہ و تار، انوار سے دور، ظلمتیں اس پر محیط ؎

عالمے مطرود و مردودِ سپہر صبح او مانندِ شام از بخلِ مہر
منزلِ ارواحِ بے یوم النشور دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور

اس جہان میں ایک قلزم خونیں رواں ہے، اس کی ہولناکیوں کا کیا بیان ہو ہوش و حواس، فرطِ ہیبت سے غائب! معانی الفاظ کے سایہ سے گریزاں! اُف ری دہشت،

تن ز سہمش بے خبر گردد ز جاں!
موج ہا در زندہ مانندِ پلنگ از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ

اس بحرِ خونیں میں وہی دو غدارانِ وطن ایک کشتی پر بیٹھے، اپنی قسمت کو روتے اور شیر سے بڑھ کر مہیب موجوں کے تھپیڑے کھاتے، آپ ڈوبتے اور جب ڈوبتے ہوئے ؎

اندراں زورق دو مرد زرد روئے زرد رو، عریاں بدن، آشفتہ موئے

اتنے میں خود ارضِ ہند

آں عزیز خاطر صاحب دلاں

کی روح نمودار ہوتی ہے حسین و جمیل، جبین پُر نور، اور آنکھیں پُر سرور، لیکن قید و بند میں جکڑی ہوئی، اور زبان پر آہِ سوزاں اور نالہائے پُر درد۔ عارف رومیؒ کی روحانیت بتاتی ہے، کہ یہی ہندوستانِ مظلوم ہے۔ ؎

گفت رومی، روح ہند ست ایں نگر ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ از فغانش سوزہا اندر جگر

روحِ ہندوستاں عالم بالا میں فریاد کر رہی ہے اور رو رو کر دوسروں کو رلا رہی ہے۔ ع

مُرد جعفر روح او زندہ ہنوز!

جعفر تو گیا، لیکن جو بیج بو گیا تھا، وہ بہر حال اب ایک تناور درخت ہو چکا ہے۔ ؎

ملتے را ہر کجا غارت گرے است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ الاماں از جعفرانِ ایں زماں

آج بھی جتنے قوم فروش اور غدار ملت موجود ہیں اُن سب کی اصل کسی صادق کسی جعفر غرض کسی غدار اعظم ہی تک پہنچتی ہے، اللہ اِن غداروں سے بچائے اللہ ہی جعفر کی تخم ریزی کے ثمرات سے اپنی حفظ و اماں میں رکھے ان بدبختوں کا ٹھکانا دوزخ میں بھی نہیں اپنے سروں کو پیٹ پیٹ کر فریاد کر رہے ہیں ؎

نے عدم ما را پذیرو نے وجود ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ وائے از بیمہری بود و نبود

تا گریشتیم از جہان شرق و غرب ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بر در دوزخ شدیم از درد و کرب

یک شرر بر صادق و جعفر نزد ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بر سر ما مشت خاکستر نزد

گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ شعلہ من زیں دو کافر پاک بہ

ہائے ہماری کمبختی، کہ نہ زندگی ہم کو پوچھتی ہے نہ موت! ہائے ہماری شامتِ اعمال، کہ موت و حیات دونوں ہم سے روٹھ گئے! ہائے ہماری بدنصیبی، کہ دنیا سے گزر کر ہم عالم آخرت میں پہنچے، تو دوزخ کے دروازہ پر گئے کہ کاش وہی ہمیں قبول کرلے جس عذاب ناقابل بیان میں ہم گرفتار ہیں اُس سے تو شاید جہنم ہی کی آگ غنیمت ہوتی، لیکن ہم کمبختوں کو تو دوزخ تک نے قبول نہ کیا! الٹا واپس کر دیا، اور خود پناہ مانگنا شروع کر دیا کہ الہٰی ایسوں کے سایہ سے محفوظ رکھ!

کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنی مدد کے لئے پکار رہے ہیں، کوئی بھی ان پر نگاہ رحم نہیں ڈالتا کوئی بھی ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا ؎

اے ہوائے تند اے دریائے خوں! اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب! اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!

اور شعر تو یہ کہا ہے، اس ایک شعر پر دوسروں کے دیوان قربان ہیں! ؎

اے بتانِ ابیض! اے مردانِ غرب وے جہانے در بغل بے حرب و ضرب

اے گورے رنگ کے خداوندو! اے فرنگستان کے امیر اور امیر زادو! اے سارے جہاں کو بے لڑے بھڑے اپنے قبضہ میں لے لینے والو!

کیا سارے "کانگرسی" لٹریچر میں اس سے زیادہ کچھ مل سکتا ہے؟ کیا بڑے بڑے "احرار" نے اس سے زیادہ کچھ کہا ہے؟

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہاست بندۂ غدار را مولا کجاست

یہ وہی بدنام اقبالؔ ہے جو (بعض مہربانوں کا خدا بھلا کرے) بیچارہ خود ہی اپنی قوم میں غدار اور قوم فروش اور خدا جانے کن کن خطابات سے سرفراز ہو چکا ہے! ہا! دنیا بھی کیسی اندھی ہے، اور اس کے فیصلے کس قدر نامنصفانہ ہوتے ہیں!

ہاں اقبالؔ کا جرم یہ ضرور ہے کہ اتنی وطن دوستی کے باوجود، وہ وطن پرستی کا روادار نہیں۔ اس کا مذہب وہی ہے، جو شیخ الہند محمود حسنؒ کا تھا۔ احرار کے رہبر و سردار محمد علیؒ کا تھا۔ اُسے مقصود وطن کی خدمت ہے، وطن کی پرستش نہیں وطنیت کا جو بُت، فرنگیوں کا گڑھا اور کھڑا کیا ہوا ہے، اس شرک کا اُس نے تار تار الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ظاہر بین خوش ہو رہے ہیں کہ ایرانؔ، رضا شاہ پہلوی کے عہد میں کیسی کیسی ترقیاں کر رہا ہے۔ شاعر کی نگاہِ حقیقت شناس دیکھ رہی ہے، کہ یہ "ترقی" عین ترقیِ معکوس ہے۔ ؎

گشتۂ کمادِ بتانِ شوخ و شنگ خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ

کار آں وارفتۂ ملک و نسب | ذکر شاپور است و تحقیر عرب
روزگار او تہی از واردات | از قبور کہنہ می جوید حیات
با وطن پیوست و از خود در گزشت | دل بہ رستم داد و از حیدر گزشت
نقش باطل می پذیرد از فرنگ | سرگزشت خود بگیرد از فرنگ

یہ ناداں اتنا نہیں سمجھتے، کہ شاپور اور یزدجرد کی عظمتیں تو از خود بجھ چکی تھیں۔ ایران کے تن مردہ میں اگر جان دوبارہ پڑی، تو اسلام ہی کے طفیل ہیں، بادیہ نشینان عرب ہی کی مسیحائی سے۔ ایراں اور رومہ اپنے زمانہ کی دو برابر کی طاقتیں تھیں۔ ایراں نے اسلام قبول کر لیا آج تک زندہ ہے، رومہ نے دین الٰہی سے اعراض کیا۔ مدت ہوئی نام و نشان بھی نہ باقی رہا۔

موج مے در شیشۂ تاکش نہ بود | یک شرر در تودۂ خاکش نہ بود
تا ز صحرائے رسیدش محشرے | آنکہ داد او را حیاتِ دیگرے
اینچنیں حشر از عنایاتِ خداست | پارس باقی رومۃ الکبریٰ کجاست
مرد صحرائی بہ ایراں جاں دمید | باز سوئے ریگ زار خود رمید
آہ احسانِ عرب نشناختند | ز آتش افرنگیاں بگداختند

وطنیت کا افسوں بھی عجب افسوں ہے۔ ترک "ترکیت" میں ایرانی، ایرانیت میں مصری مصریت، میں عرب، عربیت میں غرق ہوتے جارہے ہیں، اور اسلامیت کی طرف سے سب غافل و بے پروا۔ حالانکہ نظم و مرکزیت اگر پیدا ہو سکتی تھی تو صرف اسلامیت ہی کے رشتہ سے۔ جھاڑو کا بند کھل گیا ہے اور ایک ایک سینک مسرور و نازاں ہے کہ آزادی مل گئی! یہ وطنیت نہیں ہے۔ محمد علیؒ کے الفاظ میں "وثنیت" ہے۔ توحید الٰہی کے مقابلہ میں ایک دوسرا بُت!

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن | اہل دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق | بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیز خوب و زشت | دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت

آہ کیسی نادانی اور کورفہمی ہے کہ جو جنت کا طالب تھا وہ محض مٹی کے ڈھیلوں پر قانع ہو کر رہ گیا ہے اور اس پر فخر کر رہا ہے!

چیست دیں؟ برخاستن از روی خاک ۔۔۔ تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہو ۔۔۔ در حدودِ ایں نظامِ چارسو

آفتاب نکلتا بیشک مشرق سے ہے، لیکن نکل کر پھر مشرقی نہیں رہ جاتا، شرق و غرب، شمال و جنوب، سب ہی اُس کے احاطۂ تسلط میں آجاتے ہیں۔ بات بالکل موٹی ہے مگر جو سمجھنا نہ چاہیں، اُن کے دل میں کیسے اتار دی جائے؟ شاعر غریب اپنی والی تو سمجھاتے ہیں کچھ اٹھا رکھتا نہیں ؎

آں کفِ خاکے کہ نامید وطن ۔۔۔ ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتی ست ۔۔۔ زانکہ از خاکش طلوعِ ملتی ست
اندریں نسبت اگر داری نظر ۔۔۔ نکتۂ بینی زمو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب ۔۔۔ باتجلی ہائے شوخ و بیحجاب
در تب و تاب ست از سوزِ دروں ۔۔۔ تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
فطرتش از مشرق و مغرب بری ست ۔۔۔ گرچہ او از روئے نسبت خاوری ست

وطن کی محبت تو جانور بھی رکھتے ہیں، وطن کے لئے تو کتے اور بلی بھی جان دے سکتے ہیں۔ انسان کے لئے یہ کون سی فخر کی بات ہوئی کہ مٹی کے گھروندوں کے پیچھے جان دے رہا ہے، اُسے مرنا چاہئے تو کسی مقصد Ideal کے خاطر اور مرضی حق کی طلب سے بڑھ کر، بلند تر۔ کوئی مقصد اب تک دنیا کے سامنے پیش ہو سکا ہے؟ دوسری قوموں کی اگر نظر بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی، تو وہ بیچاری معذور ہیں، غصہ اپنوں پر آتا ہے ان پر یہ کیا شامت سوار ہے کہ آسمانوں کے ہوتے ہوئے زمین کی طرف جھکتے اور گرتے ہیں؟

سیاسیات کی بحث تو بہت بعد کو آتی ہے، فرنگیوں کے ہاتھ میں اصلی جادو

تو ان کی جگمگاتی ہوئی تہذیب کا ہے جس کے لئے اقبال نے بھی کہیں اور (شاید
اسرارِ خودی میں) کہا ہے ؎

گلستانے لالہ زارِ عبرتے
چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے!

ان کے جگمگاتے ہوئے ہوٹل اور ناچ گھر۔ ان کے کلب، اور
شراب خانے، ان کے چڑیا گھر اور عجائب خانے ان کے بنک
اور کوٹھیاں، ان کے سینما اور تھیٹر، شاعر اس نگارخانہ میں قدم رکھتا ہے اور رنگ
رنگ کے سوانگ کو دیکھتا ہے اور زیرِ لب مسکراتا جاتا ہے ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے ز عریاں ساق نے از قطعِ موست

محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است

'محکمی'، اور 'قوت' اور 'فروغ' کا اعتراف بہتان اب بھی موجود ہے۔ ایک
قدم آگے بڑھ کر، وضوح کامل ہو جاتا ہے، اور حقائق سے پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے ؎

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ
در جہانِ او دو صد فردوس رنگ

جلوہ ہایش خانماں ہا سوختہ
شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ

ظاہرش تابندہ و گیرندہ است
دل ضعیف است و نگہ را بندہ است

چشم بیند دل بلغزد اندروں
پیشِ ایں بتخانہ افتد سرنگوں

ایک جگہ اور ان کی منع تولید (اولادکشی) وغیرہ کی کوششوں کا ذکر کر کے کیا خوب کہا
ہے، کہ ان سے لینے کے قابل کوئی چیز، بجز عبرت کے، ہے کیا؟

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد، مردہ از صورِ فرنگ

حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد
از امم بر تختہ خود چیدہ نرد

شاطراں، ایں گنج ور آں رنج بر
ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

فاش باید گفت سرِّ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں

دیدہ ہا بے نم ز حبِ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر

وائے بر قومے کہ از بیم ثمر — می بردنم را ز اندام شجر
تا بتار زخمہ از نازش سرود — می کشد نازادہ را اندر وجود
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ — من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

اس یا جوجیت کے عروج کو دیکھ کر مسرت اگر کسی کو ہے، تو معبودِ قدیم، بعل کو کیسا اچھل اچھل کر گا رہا ہے، کہ (خاکم بدہن) اب فتح میں کیا دیر ہے، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کو اب مار ہی گرایا ہے ؎

زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس — آنکہ مارا از لحد بیروں کشید
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در نگر آں حلقۂ وحدت شکست — آلِ ابراہیم بے ذوقِ الست
مرد حُر افتادہ در بندِ جہات — با وطن پیوست و از یزداں گسست
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں باز آمد ایام طرب — دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب
از چراغ مصطفےٰ اندیشہ چیست — زانکہ او را پُف زند صد بولہب
گرچہ می آید صدائے لا الہ — آنچہ از دل رفتہ کے ماند بہ لب
اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب — روزِ یزداں زرد رو از بیم شب
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

شاعر گھومتا گھامتا کرۂ مریخ میں پہنچتا ہے۔ اور یہاں ایک لیڈی صاحبہ کی صحبت سے دوچار ہوتا ہے پہلے ان کا سراپا ملاحظہ ہو۔

دوسری قو...

چہرہ‌اش روشن ولے بے نور جاں — معنی او بر بیان او گراں
حرف او بے سوز و چشمش بے نمے — از سرور آرزو نامحرمے
فارغ از جوش جوانی سینہ اش — کور و صورت ناپذیر آئینہ اش

چہرہ کا رنگ گورا، لیکن باطن سیاہ اور قلب بے نور۔ زباں رواں، لیکن معنی الفاظ کا ساتھ چھوڑے ہوئے۔ نہ الفاظ میں سوز و گداز کا پتہ، نہ آنکھوں میں کسی تری کا نشان،

قلب، مقصد اعلیٰ (ایمان) سے نا آشنائے محض! دیکھنے میں جوان، لیکن جوانی میں جو ولولے فطرۃً ہوتے ہیں، وہ سب غائب، گویا ایک آئینہ، جس کی جلا اڑی ہوئی۔

اور ان صاحبہ کی خصوصیت یہ بتائی گئی، کہ

از مقام مرد و زن دارد سخن فاش تر می گوید اسرار بدن

مرد و عورت کے تعلقات پر خوب خوب نکتہ بیان کرتی ہیں، اور اعضائے جسم کی تشریح تو اس قدر بے جھجک ہو کر بیان فرماتی ہیں کہ شرم و حیا کہیں آس پاس بھی نہیں ہوتی!

ایسی نادر نعمت بھلا مریخ کی پیداوار کہاں ہو سکتی تھی، بتلایا یہ گیا، کہ

فرز مرزا اور ابد زدید از فرنگ ـــــ کرۂ مریخ کا ابلیس انھیں ارض فرنگستان سے اٹھا لایا ہے ۔ یہ خاتون، دعوے نبوت کرتی ہیں، زن پرستوں کے ملک میں نبوت عورت کو نہ ملتی تو اور کسے ملتی؟ یہ روشن خیال "روشن ضمیر" حریت پرور، برق زباں، "نبیہ" تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو بس بعینہٖ معلوم ہوتا ہے کہ لیڈیز کانفرنس کے پنڈال میں کسی رزولیوشن پر دادِ خطابت دی جا رہی ہے ۔ وہی مردوں کے مظالم کی داستان ...... وہی نسوانیت سے انکار، وہی "آزادی" کی رٹ، وہی فطرت سے جنگ پر دلیری، اور آخر میں وہی "برتھ کنٹرول" کی سائنٹفک دعوت!

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں زیستن تا کے مثال دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است دلبری محکومی و محرومی ست
در دو گیسو شانہ گردانیم ما مرد را نخچیر خود دانیم ما
خود گدازی ہائے او مکر و فریب در دو داغ آرزو مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا مبتلائے درد و غم سازد ترا
مارپیچانِ از خم و پیچش گریز زہر ہایش را بخونِ خود مریز
از امومت زرد روئے مادراں اے خنک آزادیٔ بے شوہراں
آمد آں وقتے کہ از اعجاز فن می تواں دیدن جنین اندر بدن
گرنہ باشد بر مرادِ ما جنیں بے محابا کشتن او عین دیں

درپس ایں عصر اعصار دگر — آشکارا گردد اسرار دگر
پرورش گیرد جنینِ نوعِ دگر — بے شبِ ارحام و ریا بدسحر
تا بمیرد آں سراپا اہرمن — ہمچو حیوانات ایامِ کہن
خیز و با فطرت بیا اندر ستیز — تا ز پیکارِ تو حُر گردد کنیز

اے معزز خاتونو! اے ماؤ، اے بہنو، یہ گڑیوں کی سی پردہ کی زندگی کب تک؟ یہ خانگی زندگی، تم اسے محبوبی کہتی ہو، حالانکہ یہ عین غلامی ہے محکومی ہے محرومی ہے، مظلومی ہے! تمھاری آزادیاں سلب کر لی گئیں، تمھارے حقوق پامال کر دیے گئے تمھیں لونڈی بنالیا گیا، اور تم اپنی سادہ دلی سے خوش ہو رہی ہو کہ گھر کے اندر شوہر تمھاری خاطرداریاں کرتے رہتے ہیں، خود تمھارے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں! یہ محض دھوکا اور فریب ہے، مرد کی یہ محض چالیں ہیں! خبردار آج سے اس فریب میں نہ آنا، وہ لاکھ تمھاری دلدہی کرے، تمھیں چہیتی بیوی بنا کر رکھے، اپنی معشوقہ بنائے تم سے لاکھ مہر و الفت کے پیمان کرے، ہرگز اس کی باتوں میں نہ آنا، اُس کے جال میں نہ پھنسنا سب مکر ہے مکر، اس کا مقصد محض تمھیں اپنی کنیزی میں لینا ہے۔ اُف، ظلم ہے ظلم، کہ تمھیں بچہ جننے کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے! آہا، کیسا پیارا اور خوش آیند ہوگا وہ دن، جب ہم شوہروں کی قید سے آزاد، بچہ جننے کی کلفتوں سے آزاد، بے شوہر بلا روک ٹوک آزادیِ کامل کے ساتھ گھومتی پھریں گی! اور میں آپ کو بتاؤں، ہماری سائنٹفک ترقیاں اب اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ ہم رحم کے اندر کا حال اپنے آلات سے مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اور اب ہمارے بالکل اختیار میں ہے، کہ چاہے تو رحم میں بچے کو بڑھنے اور پلنے دیں، اور چاہیں تو اسی وقت اس کا خاتمہ کر دیں۔ اور ابھی کیا ہے، ایک دن، اور آہاہا، کیسا مبارک دن وہ آنے والا ہے جب مرد کی وساطت کے بغیر، اگر جی چاہے گا تو ہم خود ہی بچہ پیدا کر لیا کریں گے اور رفتہ رفتہ ہم اسی کرخت مخلوق کو، جس کا نام مرد ہے، میدانِ کائنات سے فنا کر کے رہیں گے، جیسے اس سے پیشتر بھی، رفتار، ارتقا، میں، بیشمار قسم کے حیوانات

فنا ہو چکے ہیں! اٹھو، میری بہادر خاتونو! ہمت کر کے اٹھو! لڑو، اپنی آزادی کی خاطر، حریت کاملہ کی خاطر، فطرت سے لڑو، اور فطرت کے جن قاعدوں اور قانونوں نے تمھیں ابتک زیر کر رکھا تھا، انھیں توڑ پھوڑ کر، رکھ دو!

عارف رومیؒ کی روحانیت حیرت و عبرت کے ساتھ اس خطبۂ حریت کو سنتی رہتی ہے، اور پھر شاید عبرت و حسرت کے لہجہ میں یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے۔

مذہبِ عصر تو آئینی نگر ۔۔۔ حاصلِ تہذیب لادینی نگر

تہذیبِ جدید کا مذہب و مسلک دیکھ لیا؟ بے دینوں کے تعلیم و تمدن کے اثرات چکھ لیے؟

اور اس سے زیادہ یا اس کے علاوہ، ہم اور آپ، اور کوئی کہہ ہی کیا سکتا ہے؟

ضربِ کلیم

اقبال، مسلمانوں کی قوم کے حکیم، اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حکمت و شاعری، پختہ سے پختہ تر ہوتی جا رہی ہے ——— "خام" تو کبھی بھی نہ تھی۔ شاعری سے مراد رسمی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ مراد وہ شاعری ہے جو رومیؒ کی تھی، سنائیؒ کی تھی، وہ شاعری نہیں، جو حق سے ہٹاتی، بھگاتی ہے۔ وہ شاعری ہے، جو حق کی طرف بلاتی، لاتی ہے۔

اقبال کا پیام ساری دنیا کے لیے ہے، دنیائے اسلام کے لیے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے، لیکن حقیقۃً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا دردِ دل سنانا تو سب ہی کو چاہتے ہیں، جو پہلے سے اقبال کے خدا کی، اقبال کے رسول کی سن چکے ہیں۔ ان فی ذٰلک لذکری لمن کان لہٗ قلبٌ اوالقی السمع وھو شہید۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کچھ فارسی میں کہہ چکے ہیں، بہت کچھ اردو میں کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام "ضربِ کلیم" ہے۔ زبان اردو۔ ضخامت ۱۸۲ صفحات۔ طباعت، صاف و روشن، قیمت درج نہیں، جو کچھ بھی ہو، بہرحال کتاب کی معنویت کے اعتبار سے کمتر ہی ہوگی ——— عصائے موسیٰؑ کی قیمت کا اندازہ کوئی صاحب یوں بھی فرمائینگے، کہ اتنے فٹ لمبی، اور اتنے انچ موٹی، جنگل کی لکڑی کا مول تول بازار میں کیا ہے؟

ملنے کا پتہ، دفتر "طلوعِ اسلام" میکلوڈ روڈ، لاہور۔

بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ امت میں کس زمانہ کے لوگ بہتر ہوں گے۔ جواب میں سرورؐ و سردار کی زبان سے ارشاد ہوا، کہ میری امت کی مثال تو بارش کے قطروں کی سی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے قطرے بہتر رہے یا پچھلے —— اقبال کا کلام بھی مسلسل بارانِ رحمت سے کم نہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا، کہ بہتر کسے کہیے، اور کسے نہ کہیے۔ اور اگر کسی کو اعلیٰ و بلند ٹھہرا بھی لیجیے تو اس کے مقابل آخر ادنیٰ و پست کسے ٹھہرائیے! جب جو کلام سامنے آگیا، دل نے کہا، یہی خوب اور خوب تر۔ جب کسی دوسرے کلام پر نظر پڑی، تو اب قوت فیصلہ مغلوب، نگاہ انتخاب حیران! —— یہ اور بات ہے کہ انتخاب کی حیثیتیں ہی شروع سے مختلف ٹھہرا لیجیے، اور اس لحاظ سے فیصلہ کر دیجیے، کہ شوخی و برجستگی فلاں میں زیادہ ہے، عمق میں فلاں بڑھا ہوا ہے، اور درد و گداز میں فلاں کا نمبر اول ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

ضرب کلیم کا وصف امتیازی، حکیمانہ ژرف نگاہی ہے۔ ہر عنوان وقت نظر کا ایک مرقع، ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ، بات وہی ایک ساڑھے تیرہ سو برس کی پرانی، بلکہ اس سے بھی ہزاروں سال قبل کی، بات کہنے کے ڈھنگ نئے نئے، اور عنوانات جدا جدا۔ بات میں کشش ایک تو ہر فطرت سلیم والے کے لیے ذاتی موجود، اور پھر کہنے والے کی زبان میں موہنی۔ کتاب قدرۃً دلچسپ اس قدر ہوگئی، کہ ایک بار شروع کر کے ختم کرنے کو جی نہ چاہے، اور پڑھتے پڑھتے جب آخری صفحہ پر پہونچیے، تو دل میں یہ حسرت ہی رہ جائیے، کہ محفل برخواست اتنی جلد کیوں ہوگئی! وہی روئے گل کے سیر ہو کر نہ دیکھنے اور موسم بہار کے ختم ہو جانے کا پرانا دکھڑا!

گھر کے بھید، گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں، بتکدۂ آزر پر تیشۂ ابراہیمی سے بڑھ کر کسی کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسم افرنگ کو توڑنے کے لیے افسوں خاں اقبال سے بڑھ کر کون ملیگا —— اُسی طلسم کدہ کا پروردہ اسی میکدہ کا سرشار۔ ؎

مدتے محوِ تگ و دَو بودہ ام   رازدانِ دانشِ تو بودہ ام

باغباناں امتحانم کردہ اند محرم ایں گلستانم کردہ اند
مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم

کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجیے۔ ایک ہی چمن کی گلکاریاں نظر آئینگی توت اگر بے دینوں کے ہاتھ میں ہے تو دنیا کو نمونہ جہنم بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ وہی توت اگر حق پرستوں کے ہاتھ میں ہے، تو جنت کی رہبر ؂

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک!

شیخ جدید کا فتوے ہے کہ اب جہاد بالسیف کو منسوخ سمجھو، اب تو صرف قلم کافی ہے۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ جہاد سیفی کی منسوخی کے اعلان کا بھلا اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے کیا محل ہے!

تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں؟ ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بےخبر!

اور ہائے ؂ دل پھڑک کر سینے ؂

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر!

اب تو

تعلیم اُس کو چاہیے ترک جہاد کی دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر!
باطل کے بال و پر کی حفاظت کے واسطے یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر!

اب دوسرے مصرعۂ یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر، کو مکرر پڑھے بغیر، اس سے لطف لیے بغیر، آگے بڑھ جانا ہی ظلم ہے۔ ظلم شاعر پر نہیں، خود پڑھنے والے کے ذوق سلیم پر۔

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر!

جس لفظی طلسم بندی کا نام یونان نے کبھی اور یورپ نے آج بھی، فلسفہ رکھا ہے،

کہتے ہیں، کہ وہ نواجوانوں کے دلوں میں، مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے، اس کی حقیقت کوئی اس کے دل سے پوچھے، جو خود ان گلیوں کی خوب خاک چھانے پڑا ہو۔ شاعر آج نہ سہی، چند سال اُدھر تو آخر جوان تھا، اور انھیں ڈگریوں اور امتحانوں اور پروفیسروں کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا چکا ہے ؎

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گذر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے نہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے!

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اقبال کی ایک تازہ اور ایک کسی قدر قدیم، دو فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے، اور اقبال کے کلام کی مدح و توصیف میں اب کچھ کہنا، شاعر کی داد سے زیادہ خود اپنی سخن فہمی کا اعلان کرنا ہے اور اپنی جوہر شناسی کا اشتہار دینا ہے آفتاب کے روشن ہونے کی اگر آپ شہادت دے رہے ہیں، تو یہ ثبوت تو آفتاب کی روشنی سے بڑھ کر خود آپ کی بصارت کے صحیح و تندرست ہونے کے حق میں ہوا حضرت رومی

مادحِ خورشید مدّاحِ خود است　　　　کہ دو چشمم روشن و نامر مد است

کتاب کا موضوع، عنوان سے ظاہر ——— اور ایک ہی موضوع تو لے دے کے اب اقبال کے پاس رہ گیا ہے۔ پرانے ہونے پر ہمیشہ نیا! کثرتِ تکرار کے باوجود ہر دم تازہ و شگفتہ! "عشق"، گنتی میں ایک، کیفیاتِ عشق ہر روز جدید، لذاتِ عشق، ہر لمحہ مزید!

زبان فارسی، لیکن اتنی سلیس کہ گویا اچھے پڑھے لکھوں کی اُردو۔ کوئی ذرا سا بھی مشکل یا نامانوس لغت اگر آ گیا، تو اس کا حل وہیں حاشیہ میں موجود شروع ہی میں پڑھنے والے سے فرماتے ہیں کہ ہوش و خرد نے حرم میں بغاوت برپا کر رکھی تھی، میں اس کے لیے دیارِ عشق سے لشکر جرار لے کر آ رہا ہوں - یہ نہ سمجھنا کہ عقل کے لیے یوم الحساب ہے ہی نہیں،

نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است!

تمہید کا آغاز جس نام نامی سے ہوتا ہے، اُس سے دنیائے عشق میں کون ناواقف ہے؟

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر　　کاروانِ عشق و مستی را امیر
نور قرآں درمیان سینہ اش　　جام جم شرمندہ از آئینہ اش

ان کی روحانیت مکشوف ہوکر اقبال سے کہتی ہے ؎

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ　　کس نکو ننشست در نارِ فرنگ
باش مانند خلیل اللہ مست　　ہر کہن بتخانہ را باید شکست
عصرِ تو از رمز جاں آگاہ نیست　　دینِ او جز تب غیر اللہ نیست
سرِّ شیریں را نہ فہمد گاؤ میش　　جز بہ شیرین کم بگو اسرارِ خویش
با حریفِ سفلہ نتواں خورد مے　　گرچہ باشد بادشاہ روم و رے
یوسفِ ما را اگر گرگے برد　　بہ کہ مردے ناکسے او را خرد
معنیِ دین و سیاست باز گوے　　اہل حق را زیں دو حکمت باز گوے

ساری مثنوی اسی پیام کی شرح و تفصیل میں ہے۔ 'حکمت کلیمی'، 'حکمت فرعونی'، کے بعد ایک عنوان لا الہ الا اللہ ہے۔ اس کے تحت میں فرماتے ہیں، کہ لاؔ جلال ہے، الّاؔ جمال۔ لاؔ نفی۔ اِلّاؔ، اثبات۔ لاؔ، نیستی، اِلّاؔ، ہستی۔ سارا نظام کائنات انھیں دو حرفوں کی قوت عمل کا تماشا گاہ ہے۔ ابتدا لاؔ ہی سے کرنی چاہیے، اور غیر اللہ کے مقابلہ میں وظیفۂ حیات اسی کو بنانا چاہیے ؎

ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون　　حرکت از لا زاید از الّا سکون
در جہاں آغاز کار از حرف لاست　　ایں نخستیں منزل مردِ خداست
پیش غیر اللہ لا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامۂ او کائنات

آگئے ایام عرب، وغیرہ سے گزرتے ہوئے، دورِ حاضرہ کے سرمایہ سوز، روس تک پہنچ جاتے ہیں، اور ذرا دیکھیے، کہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں ؎

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ　　بندگی با خواجگی آید بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں　　از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لاسلاطیں، لاکلیسا، لا الٰہ
فکر او در تُندِ بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

انجام جو ہونا ہے، ظاہر ہے ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں

اس لیے، کہ

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

اقبال کے سردار و آقاؐ نے تو یہ فرمایا تھا، کہ کل روئے زمیں میرے لیے سجدہ گاہ ہے، اور کہاں آج دیکھنا یہ پڑ رہا ہے، کہ یہ مسجد اپنوں کے نہیں، بیگانوں کے قبضہ میں ہے ؎

مومناں را گفت آں سلطان دیں — "مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں"
الاماں از گردشِ نُہ آسماں — مسجدِ مومن بدستِ دیگراں!

دوسروں کا فقر، رہبانیت اور جوگ ہے، مومن کا فقر تو عین بادشاہی و حکمرانی ہے ؎

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ کافر، خلوتِ دشت و در است — فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر — از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حُنین — فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

"زمانہ" نے ہمیں کہاں کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اور عصرِ حاضر سے مقابلہ کے وقت ہم نے کیسی پہلی ہی بازی میں اپنی ہار مان لی، اس کا ایک جلوہ اس آئینہ میں ملاحظہ ہو

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصر ما با ما چہ کرد
عصر ما ما را ز ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد
سوز او تا از میانِ سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
باطنِ ایں عصر را نشناختی — داد اول خویش را در باختی!

تہذیب فرنگ کی مصوری اقبال خدا جانے کتنی بار کر چکے ہیں، لیکن ہر نیا نقش اپنی دلآویزی میں، پچھلے نقوش سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا ہے۔ ایک طویل نظم کا عنوان وہی ہے، جو کتاب کا ہے، "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"۔ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ تا کجا در قیدِ زنّار فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد زیر گردوں رسم لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برّہٗ ہر زماں اندر کمین برّہٗ

....

دانش افرنگیاں تیغے بدوش در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
آہ از افرنگ و از آئین او آہ از اندیشۂ لادین او
علم حق را ساحری آموختند ساحری نے کافری آموختند
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن سحر ایں تہذیب لادینی شکن

ردّ بلا تو مومن کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مومن اگر اپنے ایمان پر جم جائے، اور اپنی خودداری پر ثابت قدم رہ جائے تو سارا طلسم آناً فاناً ٹوٹ کر رہتا ہے ؎

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم از و نشتر از و سوزن از و ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی بادشاہی قاہری ست قاہری در عصرِ ما سوداگری ست
تختۂ دوکان شریک تخت و تاج از تجارت نفع و از شاہی خراج
کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ او ست مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بے نیاز از کارگاہِ او گزر در زمستاں پوستینِ او مخر
ہوشمندے از خُمِ اُو مے نخورد ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا قند قند و کم خروش ما چو طفلانیم و او شکر فروش

اقتباسات بہت ہو گئے۔ جبر کر کے قلم روکنا پڑتا ہے، ورنہ اگر طبیعت پر چھوڑ دیا جائے، تو شاید ساری کتاب ہی اول سے آخر تک نقل ہو کر رہے "اللہ مست"، "مولا صفات"

"خود گداز" اور اس قسم کی دوسری حسین ترکیبیں تو اقبال کا حصہ ہو چکی ہیں۔ ان پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ دوسری مثنوی مسافر کے نام سے ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں، تھوڑی ہی تعداد میں نکلا تھا، اس لیے زیادہ پھیل نہ سکا۔ دنیا کے لیے کہنا چاہیے کہ یہ مثنوی بھی نئی ہی ہے —— اقبال، نادر شاہ شہید کی دعوت پر، مع مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود، ۱۹۳۳ء میں کابل گئے تھے، واپسی پر اپنے تاثرات اس مثنوی میں جمع کردیے ہیں، اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل باتیں تھیں، سب کہہ ڈالی ہیں۔ نادر کون ہے؟ مدح و صف کے شعر بہت سنے ہونگے، ذرا تعارف نامہ کا ایک شعر اقبال کی زبان سے سنیے ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگہ　　　هر دو گوہر از محیطِ لا اِلٰہ

اسی سفر میں اقبال، شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں، اور کیسے رنگ و بو کا گلِ عقیدت، مزار پر چڑھاتے ہیں ؎

خوشا نصیب کہ خاک تو آرمید این جا　　　کہ این زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است

غزنی میں حکیم سنائی کی قبر پر جاکر مراقب ہوتے ہیں، اور بہشت بریں سے صدا سنتے ہیں ؎

دین محو اندر کتب اے بے خبر　　　علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

مزار سلطان محمودؒ پر جو کچھ گزری ویرانہ غزنی میں مناجات پڑھنے والے نے کیا دیکھا اور کیا سنا اور کیا کہا۔ اس قسم کے سارے دلکش منظر کے لیے تو اصل کتاب کو ملاحظہ فرمائیے، آخر میں صرف اتنا اور سن لیجیے، کہ اقبال کو شاہ شہید کی اقتداء میں نماز عصر پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا تھا آہ! کہاں وہ ایک نماز شاہِ اسلام کے پیچھے اور کہاں دوسری صدہا نمازیں! شاعر اگر ان مقامات کی شرح کرنا چاہے بھی، تو بیان پر قدرت کہاں لاسکتا ہے۔ مجبوراً بس اتنی سی کسک دلوں میں پیدا کرکے رہ جاتا ہے ؎

رازہائے آں قیام و آں سجود　　　جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود!

جھوٹ میں سچ

"قصۂ گُل بکاؤلی" بھی کوئی کتابوں میں کتاب ہے؟ عجب نہیں، کہ ایک سنجیدہ پرچہ میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر تبسم آجائے۔ لیکن کیا ہرج ہے، اگر کبھی کبھار، خلاف وضع و خلاف عادت صحبتوں کا بھی تحمل کرلیا جائے۔ اور پھر دنیا میں یوں بھی بارہا ہوا ہے، کہ پھٹی پُرانی گدڑیوں کے اندر سے لعل و جواہر نکل آئے ہیں۔

بادشاہ زین الملوک کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں۔ پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے، اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہوجاتا ہے۔ اطبانے کہا، کہ شفا صرف اُس پھول سے ممکن ہے، جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجواں شہزادے اُس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں، اور سفر کرتے کرتے ایک بازاری عورت کے دروازہ پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زرنقد ہے۔ دولت کے نشہ میں اندھے، شہزادے اُس کے مکان پر پہنچ کر، اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پندنامہ نہیں، عشق و عاشقی کا افسانہ ہے، چاہیے تھا کہ مصنّف اس بیسوا کے ذِکر میں خوب کھُل کھیلتا، اور اس "پری جمال" کے حُسن و شباب کی مصوری اس انداز سے کرتا، کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق و اشتیاق کی آگ بھڑک اُٹھتی، لیکن برعکس اس کے، نظر الفاظِ ذیل سے دوچار ہوتی ہے:-

"سنتے ہی اُس مکارۂ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمد اللہ مدتِ مدید کے بعد..... ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا۔ اغلب ہے کہ دام میں پھنسے، پھڑک پھڑک کر مرے نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے سو خدا نے ویسے ہی شخص بھیج دیے۔"

ان الفاظ کو، خصوصاً جو عبارتیں زیر خط کر دی گئی ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد فرمائیے، کہ شوق و اشتیاق کی آگ کچھ بھڑکی، یا جو تھی، وہ بھی ٹھنڈی ہو کر خاکستر بن گئی؟ کتاب دَوریا جوجی سے بہت قبل کی تصنیف ہے۔ مصنف، تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پیالہ کو شربت کا گلاس کہہ کر پیش کرنے کے "آرٹ" سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا، وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے، کہ یہ بدی ہے، للّلہ اس کے فریب میں نہ آجانا۔

وہ بیسوا، ایک خاص چالاکی کے ساتھ، شطرنج کا کھیل کھیل کر، اپنے ہاں آنے والے امیرزادوں کو ہرا دیتی تھی، اور پھر اُن کی جائداد لے لوا اُنھیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ ان چاروں شہزادوں کو بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے جا کر انھیں چھڑایا۔ اور یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے، کہ یہ سب کے سب شہزادے اپنے نابینا والد کی آنکھ کے علاج کے لیے، تلاش گُل بکاولی میں گھر سے نکلے تھے۔ مشرق کی بازاری کتاب کے مصنف کا قلم ان واقعات سے نتائج یہ نکالتا ہے:-

"اے عزیز تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا۔ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادّہ اور مجرد کا تھا، جب اُس کی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی، اس کی بصارت کو زنگ لگا اور دیدۂ روشن تاریک ہوگیا،

اب اُٹھ اور سرمۂ بینائی ڈھونڈھ - یعنی گل مراد کی تلاش میں کوشش کر - لیکن راہ میں دنیائے عیارہ کی بازی بن کر تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے، مشغول نہ ہونا - مبادا وہ فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے مُبتلا دے، اور بعد اس کے مکر کی بلّی اور فریب کے چوہے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنے حسبِ مرضی پھینکے اور اچانک تیرے توکل کا سرمایہ آخر ہو جائے، تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے - اگر تو صبر کے نیولے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازی طلسم کو درہم کر دے، تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہمنشیں ہے، تیری فرماں بردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر لُبھائے پھر اگر تو اس کے مُنہ پر الفت سے نگاہ نہ کرے، تو یقین ہے کہ گلِ مراد کے دامن تک تیرا دسترس ہوے"

ضمناً ایک حکایت ایک سادہ لوح برہمن کی آجاتی ہے، جس نے ایک بندھے اور جکڑے ہوئے شیر کی زنجیریں کھول دی تھیں - اور شیر نے خود اُسی پر حملہ کر دیا تھا - تاج الملوک اِس حکایت کو اس بیسوا سے بیان کرتا ہے، اور معاً بعد ایک ناصح مشفق بن جاتا ہے :-

"اے عزیز، سچ ہے، جو کوئی بیصبری اور فریاد اپنے نفس کی جو مثلِ شیر جسم کے پنجرہ میں ہے، سنے، اور اس کے حال پر رحم کر کے صبر و توکل کی رسی اُس کے ہاتھ پاؤں سے بے محابا کھول دے، تو بہر صورت آپ کو اُس کا لقمہ بنائے مگر خضر راہنما دستگیری سے بچے تو بچے اے بیسوا یہ ذِکر میں نے اس واسطے کیا جو تو جانے کہ طاقتِ جسمانی طاقتِ روحانی پہ زیادتی نہیں رکھتی، اب تجھے یہ لازم ہے کہ پورب پچھم کے شہزادوں کو جو تو نے اپنے مکر و فریب سے قید کیا ہے، چھوڑ دے حق تعالیٰ تجھ کو بھی دوزخ کی قید سے نجات دیگا"

یہ آپ کوئی مبتذل و عامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یا کسی عارف کے حلقۂ موعظمت و معرفت میں بیٹھے ہوئے ہیں ؟ یہ مشرق کی گری ہوئی تصنیفوں میں ہے، مغرب کی بلند پایہ تصانیف کو اس کے مقابلہ میں لا کر دیکھیے!

تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ گلِ بکاؤلی قلعۂ بکاؤلی میں ہے، جس کے پہرے پر ۱۸ ہزار دیو متعین ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا ہے، اور دیووں کی ایک بوڑھی سردارنی حمّالہ کا دل اس حد تک اپنی مٹھی میں لاتا ہے، کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دیتی ہے۔ افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے :۔

"اے عزیز روشنی چشم ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے۔ اور تجلّی باری تعالیٰ کہ نورِ دیدۂ اولیا ہے، ستر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ وہ پردے درمیان سے اُٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیوِ نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر، کہ وہ لعین اپنی کجروی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچا دے[1]۔ لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دل سے اُلٹا لیجیے، تو سیدھا پڑے۔"

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے، اور اُس عزیز و عزیز الوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر، سخت پریشان اور ملول ہوتی ہے۔ لونڈیاں باندیاں، ماما، اصیلیں صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش وسعی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر بکاؤلی خود اُس "چور" کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے، اور تلاش و جستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے۔ افسانہ نگار اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درسِ معرفت شروع کر دیتا ہے :۔

---

[1] تلمیح ہے قرآن پاک کے مقاماً محموداً کی جانب۔

"سبحان اللہ کیا اُلٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہو اور عاشق اُس کا مطلوب، لیکن نظرِ تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے، کیونکہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو، اُس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بیفائدہ۔ آتشِ طلب کی جو عاشق کے گریبان سے مشتعل ہے، فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود
گر نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی۔ قلم کہتا ہے اے شخص بس کر میں نے لکھنے میں بہت سی کوشش کی اور ہاتھ اپنی سعی کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قلم نے کیا کیا ہم نے لکھا۔ بازو اپنے تردد کا دم مارتا ہے کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا سو میں نے کیا۔ غرض اس طرح اسباب تحریر کے بڑھے اور ایک پر ایک کو فوقیت ہوتی گئی، دفعتاً ایک ایسا سبب پایا گیا کہ وہ محتاج کسی کا نہ تھا، پس اے عزیز اگر تو بتا دے کہ فی الحقیقت لکھنے میں کس کی سعی ہے اور ظاہر میں کس کی، تو میں بھی عاشق و معشوق کی سعی کا جواب دوں"۔

کیا اب بھی آپ کی یہ رائے قائم ہے، کہ اس عامیانہ قصّہ کا ذکر سنجیدہ پرچہ میں لانا نازیبا اور بے محل تھا؟

بادشاہ، شہزادہ تاج الملوک کی صورت سے بیزار ہو چکا تھا، اُسے ملک بدر کر چکا تھا، پر اُس نے اپنی خدمت اور سعادتمندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ مہینوں اور برسوں کی تکالیف شاقہ اٹھا کر گلِ بکاؤلی لے کر آیا، راہ میں چاروں بڑے بھائیوں نے اُس سے چھین کر اس کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کیا۔ بادشاہ عارضی طور پر ان چاروں سے بہت خوش ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایۂ تخت کے قریب پہنچا، اور دیووں کی مدد سے اس کے مقابل ایک دوسرا

شہر نہایت ہی پُر رونق آباد کیا، اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت شروع کی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس ہوکر بہتر سے بہتر رپورٹیں پہنچائیں۔ آخر بادشاہ خود ملنے آیا، اور یہ پہچان کر کہ اپنا ہی لختِ جگر ہے، بیحد مسرور ہوا، گلے سے لگالیا ہر طرح کے اعزاز سے سرفراز کیا، اور وہ چاروں بھائی مقہور و مردود قرار پائے۔ قصّہ کے اس جھوٹ میں، اب سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز، تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہوگی۔ چاہیے کہ شہزادے کے مانند کار شایستہ کرے تو تیری محبت شاہ کے دل میں موثر ہو، اور پیغام اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے بلکہ بیبا کانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے، اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی سے لگالے اگرچہ پہلے دیدار کے لایق نہ ہو لیکن آخرکار اُسی مقام میں آپ کو پہنچائے کہ وہاں کوئی تیرا شریک نہ ہوسکے۔ پھر ایسا کام نہ کیجیو کہ شاہزادوں کے مانند داغِ لعنت اُٹھائے اور کس و ناکس کے روبرو رسوا ہو۔"

رینالڈز، اور میری کاریلی، اور اِڈ گر ویلس، اور آسکر وایلڈ کو چھوڑیے، اسکاٹ اور جارج ایلیٹ، ڈکنس اور تھیکرے، برناڈشا اور ایچ، جی، ویلز کے ہاں بھی اسی انداز کے مواعظ و معارف ملیں گے؟

تاج الملوک ایک بار پھر مصائب و آفات کا شکار بنا۔ طلسمی عصا اور ٹوپی کو الگ رکھ کر سو گیا۔ سو کر اٹھا، اور ایک حوض شفاف میں نہانے کو اُترا تو مرد سے عورت بن گیا۔ طرح طرح کے مصائب جھیلے۔ مدت کے بعد پھر ایک حوض میں غوطہ لگایا۔ اب کی جو سر نکالا، تو از سرِ نو اپنی اصلی ہئیت پر آگیا۔ یہ طلسماتی کارخانہ، داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینۂ حقایق و معارف بن جاتا ہے:۔

"اے یاران دہر، حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عصمت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے، عافیت کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ گل اور غار اور آب و سراب خوب پہچانے۔ ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے، ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کہ یہاں کانٹے گل سے رنگیں اکثر اور شراب بہ صورت آب اِدھر اُدھر ہے۔ اے عزیز اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمۂ جہاں میں غوطہ ماریگا مقرر اپنا کلاہ اور عصا کھو دیگا۔ یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالبِ دُنیا مؤنث ہیں اور طالب مولیٰ مرد ہیں۔ تیرا پیکر معانی جو مانند مردِ کامل ہے، بہ صورتِ زنان ناقص العقل ہو جائیگا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے ذکرِ الٰہی میں غوطہ مارے۔ اس کے بعد جو سر اٹھائیگا، وہی عصا ہاتھ میں اور وہی ٹوپی سر پر رکھیگا۔"

یہ وہی کتاب ہے، جسے آپ اب تک سر بسر بازاری اور متبذل سمجھے ہوئے تھے؟ اور جس کا ذکر تک سنجیدہ صحبتوں میں آپ کو گوارا نہ تھا؟

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ، اور باہم عقد کے خواہاں ہیں۔ لیکن کہاں پری اور کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوئی ہے کہ خاکی کے ساتھ اپنی نورِ نظر کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبو دی جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر مہربان ہو جاتی ہے۔ اس کی سفارشی بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو بھی چھڑتی ہے، اور اُس وقت یہ پری، رومی و غزالی کی زبان میں حقیقت انسانی پر یوں ایک مقالہ سُنا جاتی ہے:-

"سچ کہتی ہے لطیف کو ہم صحبتِ کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے

لیکن تو حضرتِ انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیال فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ سُن اے نادان، بشر خلیفۂ یزداں ہے اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے۔ اس کے رُتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بہنے والا، اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا۔ جامع کمالات علم کونی و الٰہی کا یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور بادشاہی کا ؎

انساں کی ذات برزخِ جامع ہے بے گماں
ظلِ خدا و صورتِ خلق اس میں ہے عیاں

جان کہ صوفیہ ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالیٰ کا ایک ایک اسم اور صفت کا مظہرِ خاص جانتے ہیں اور اس عالمِ صورت کو کہ حواسِ ظاہری اور باطنی سے نسبت رکھتا ہے اُس عالم کا سایہ۔ پس ہر ایک ذرّہ فرد کائنات سے روشن ایک تجلی ابدی اور سیراب ایک قطرۂ سرمدی سے ہے ؎

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عالم میں انسان کہ سارے افراد کون و فساد اُس کے لازمی ہیں خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے اور اس کی تجلیات خاص کا مقام۔ کلامِ فضیلت انسان میں دریائے بے پایاں ہے اس قدر پر اکتفا کیا۔"

مغربی افسانوں اور ناولوں، ڈراموں اور ناٹکوں، تھیٹروں اور سینما گھروں پر اس تعلیم کا کوئی سایہ بھی پڑنے پایا ہے ؟

تاج الملوک ایک بار پھر آوارۂ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں پردیس میں

گھوم رہا ہے، گردش سوار ہے۔ اُس مُلک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بیگناہ کو گرفتار کراتا ہے۔ فسانہ نگار اس بات سے بھی ایک بات پیدا کر لیتا ہے :-

"سچ ہے کہ جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی گوناگوں تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے نہ پاوے۔ اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے۔ اے عزیز حق تعالیٰ نے عالمِ ارواح کو بدن سے رخصت دی ہے۔ پس جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو حقیقت میں روح سے ہے۔ غرض کہ جو فساد کہ اس عالمِ کون و فساد میں ہو تو اس کی طرف سے جان، لیکن شر نہ سمجھ کہ در پردہ وہ خیر ہے کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں۔"

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اُس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے تئیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی۔ وہ کسی کے بھی حسن و جمال زیب و زینت سے متاثر نہ ہوا۔ شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی۔ تاج الملوک پر یہ آتش باطنی اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے، کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیے۔ کہتا ہے :-

"سُن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہِ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا۔ عجز سے کہا کہ عبادت تیری میں نے جیسی چاہیے نہیں کی۔ پھر کس کا مُنہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی گھریا میں یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کے مانند خاک ہو جائے تا شاہانِ اکسیر پسند کی آنکھوں میں سونے سے زیادہ نظر آئے۔"

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہو گئی لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم

بات کا رُخ معاً یوں پھیر دیتا ہے :۔

"اے عزیز، جب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حُسن کو دیکھنے والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی ہرچند بے پردہ ہو۔ پہلے خار رغبت اغیار کو دل کی سرزمین سے اُکھاڑ کر پھینک دے، پھر گُل رخسار یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشنِ وجود کو بنظر تامل دیکھے تو ان میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں۔ دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰-۹۲ صفحے کا ہے۔ اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ اب کتاب ختم ہونے کو آگئی۔ دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرمالیے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام، بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر عاشق و شیدا ہو جاتا ہے۔ باریابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر و حکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشق فانی میں عشق باقی کا رنگ ملاحظہ ہو :۔

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اُس کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وضع کا کلام فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے، کہ خصائل خدا کی پیروی کرو تاکہ قربت اُس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوتگاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے۔ مگر اُس کے ظاہری غصّہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے یہ دیکھ، جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے۔ خود، اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں۔ نگاہِ عبرت اس میں بھی ایک منظر معرفت دیکھتی ہے :۔

"اے عزیز اگر اپنے نورِ عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائیگا تو تجلی یار سے فائدہ نہ پائیگا۔ اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیات ابدی کب تیرے پاس آئے۔ جو راہ عشق میں آپ سے نہ گزرا وہ منزلِ مقصود میں کب پہنچا۔"

روح افزا نے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر کے اثر سے پرندہ بنا کر ایک پنجرہ میں بند کر کے لٹکا لیا ہے، کہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے ماں کو کچھ سن گن ملتی ہے، چور کے ڈھونڈھنے کو آتی ہے، اور گھر کا کونا کونا ڈھونڈھ مارتی ہے، چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال بھی نہیں جاتا، حالانکہ وہ بالکل نظر کے سامنے ہے فسانہ نگار یہاں بھی پتہ کی بات سے نہیں چوکتا:۔

"اے عزیز تو عرش پر کس کے ڈھونڈنے ارادہ رکھتا ہے، جو تیرے خانہ دل میں ہے، اُس کی تو تجھے خبر نہیں۔ واہ واہ دُور کا دھیان اور نزدیک آپ سے انجان۔"

دو سطریں آگے بڑھ کر اسی پرند اور قفس کی کہانی کو ایک پورا مقالۂ حکمت بنا دیتا ہے، اور اسی پر کہنا چاہیے، کہ افسانہ کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے:۔

"اس کی کنہ سمجھ لے اے نادان، بہ سبب علاقہ، روح سبزہ زار دنیا کی سیر کو آتی ہے۔ جب تک یہ مربع طلسم عناصر اُس کے گلے میں پڑا ہے اور قفس وجود میں طوق بندگی اس کا گلوگیر ہے۔ چشم ظاہر میں مشتِ خاک کے سوا کچھ نہیں دکھتی۔ جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا کیفیت اس کی کھل جائیگی کہ وہ کون ہے اور یہ نیرنگ کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے، جب لوگ آدینگے اس حال سے ہونگے۔ وجود مطلق ایک دریا ہے اور ہر موجود مثل حباب ہے جب حباب سے ہوا نکل گئی، دریا کے سوا کچھ نہیں۔ پس تامل سے دیکھ کہ اصل ہستی دریا کی ہے۔ لیکن فرق مرتبہ کا

البتہ ہے حباب کو کوئی دریا نہ کہیگا اور دریا کو حباب۔ اور کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں، اور بتخانہ کو کنشت، جہنم کو دوزخ اور جنت کو بہشت۔

ہر مرتبہ میں اور ہی حکم وجود ہے
زندیق ہے جو فرق مراتب کرے نہ تو

واقعی مسئلہ وحدتِ وجود کا مشکل ترین مسائل ہے اور بہتیرے اس بحرِ عمیق میں گر کے مذہبِ جبری کے بھنور میں جا پڑے اور اکثر مسلک دہری کے گرداب میں ڈوبے۔ ہادی یہاں فضلِ الٰہی اور کرم رسالت پناہی کے سوا کوئی نہیں۔"

جو تصنیف "ننگ مشرق" تھی، اُس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو تصانیف "فخر مغرب" ہیں، کیا انھیں اس کے مقابلہ میں لایا جاسکتا ہے؟ ہمارے ہاں کی جو سچّی کتابیں، سچّوں پر اُتری ہوئی یا سچّوں کی لکھی ہوئی ہیں، اُنھیں چھوڑیے، اُن کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجیے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں جنھوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں، چمکایا ہے، ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں اور گہری سچائیاں آپ نے دیکھ لیں؟ جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں، جس قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچّے ہوں، کیا خدا کی شان ہے، کہ اسے درسِ اخلاق دینے وہ قوم آئی ہے جس کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

ایک مکالمہ

ریڈیو پر

[ذیل کا مکالمہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۳ر دسمبر کی شام کو نشر ہوا۔ عنوان تھا "موجودہ سائنس دنیا کے حق میں رحمت ہے یا زحمت؟" اور مدّتِ مکالمہ تھی ۱۵ منٹ۔ ریڈیو کی ساری تقریروں اور مکالموں کے سلسلہ میں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ عنوان و مدّت وغیرہ کا سارا تعین کارکنانِ محکمۂ مذکور ہی کے ہاتھ میں ہے، اور اس کے علاوہ اور بہت سے قیود و شرائط محکمہ کی طرف سے عائد ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ زبان بہت سادہ ہو، عربی و فارسی الفاظ کم سے کم لائے جائیں، "فرقہ واریت" کی جھلک کہیں سے نہ آنے پائے، کسی مذہبی یا سیاسی گروہ کی دلشکنی نہ ہونے پائے۔ حکومت وقت کے یا کسی دوسرے مذہب کے خلاف، ہلکی سے ہلکی تعریض، بعید سے بعید صورت میں بھی نہ پیدا ہو، وقس علیٰ ہذا۔ تقریر یا مکالمہ ان سب قیود کو ملحوظ رکھ کر تیار کرنا پڑتا ہے، اس پر بھی بعض مرتبہ، عین وقت پر "محتاط" حکام ریڈیو کی نظرِ احتساب پڑ ہی جاتی ہے، اور خاص خاص لفظوں اور فقروں کے ادا کرنے کی کسی طرح اجازت نہیں ملتی۔ چنانچہ یہی صورت مکالمۂ ذیل کے ساتھ بھی پیش آئی۔ مکالمہ میں حصّہ لینے والے مُدیر صدق ("شیخ صاحب") کے علاوہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن ہی کے اسٹاف کے دو صاحب ("میر صاحب" اور "مرزا صاحب") اور تھے۔ مکالمہ اسٹیشن مذکور کے ڈائرکٹر کے شکریہ کے ساتھ شایع کیا جاتا ہے]

میر صاحب۔ آداب بجالاتا ہوں، سرکار، مزاج شریف۔

شیخ صاحب - آہا، جناب میر صاحب قبلہ ہیں۔ تسلیم۔ تشریف لائیے یہ آج چاند کدھر سے نکل آیا - اچھا اب سمجھا - مرزا صاحب ساتھ ہیں، یہی گھسیٹ لائے ہونگے۔

مرزا صاحب - جی اور کیا - یہ بھلا اب ریڈیو چھوڑ کسی سے ملتے ملاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میں گرفتار کر لایا - آپ کو ان کے شوق کا حال معلوم ہے نہ شیخ صاحب؟

میر صاحب - خیر یہ تو مرزا کی شاعری ہے - ہاں یہ ضرور ہے کہ جب سے ریڈیو لے لیا ہے، باہر نکلنا ذرا کم ہو گیا ہے - ظالم میں کچھ ایسی لذت ہے کہ چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا - اور بھئی چیز بھی تو ایسی ہی ہے - چوبیسوں گھنٹے کا مصاحب - دن بھر چاہے، باتیں سنا کیجیے - دل بہلایا کیجیے - نہ لڑائی جھگڑے کا ڈر، نہ کسی کی حکایت شکایت - میں کہتا ہوں شیخ صاحب ان ولایت والوں کو سوجھی بھی کیا کیا ہے - کیسی کیسی چیزیں ایجاد کر دی ہیں - ان کا سائنس ہے کہ جادو - کوئی حد ہے ان کی عقل کی رسائی کی -

شیخ صاحب - جادو آپ کی عقل پر تو ضرور چل گیا ہے - مرد آدمی، عقل نام ہے قوتِ فکری کا - ان مشینی ایجادوں سے قوّتِ فکری کی کون سی کرامت ثابت ہو گئی؟ بس وہی جیسے ہمارے ہاں بڑھئی، لوہار، مستری، کاریگر ہوتے ہیں، ویسے ان کے ہاں انجیر، مکینک - تجربہ ان کا بڑھا ہوا، بہت بڑا ہوا سہی -

میر صاحب - حد کر دی آپ نے بھی شیخ صاحب - یہ کوئی کمال ہی آپ کے نزدیک نہ ہوا کہ آدمی گھر بیٹھے سیکڑوں ہزاروں میل کی خبریں دم بھر میں سُن لے - لندن کا آدمی گویا دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا - اور اب تو بولنے والے کی تصویر بھی آجایا کریگی - اور پھر خرچ ہی کیا - دو چار سو میں اچھا سا سٹ لے لیجیے - دیہات میں بیٹری لگا کر سنیے، سفر میں ساتھ رکھیے -

شیخ صاحب - جی ہاں، اور یہ کمال کچھ کم ہے کہ گھر بیٹھے جن بائی صاحبہ کا چاہیے پتہ لگا لیجیے - نہ بدنامی کا ڈر، نہ گلیوں میں خاک چھاننے کی ضرورت -

میر صاحب - لاحول ولا قوۃ - آپ کی نظر بھی سب چھوڑ چھاڑ کہاں جا کر پڑی!

میں کہتا ہوں کہ اول تو موسیقی کی سرپرستی میں عیب ہی کیا ہے۔ زندہ قومیں تو زندہ اسی کے دم سے ہیں۔ اور پھر مانا کہ ایک عیب آپ نے ٹٹول لیا، تو ہنر بھی تو اس کے مقابلہ پر دیکھیے۔

شیخ صاحب ۔ وہی تو جاننا چاہتا ہوں، یہ مشین پر مشین جو دن پر دن ڈھلتی جاتی ہے، آخر اس سے کیا فائدہ دنیا کو پہنچ رہا ہے؟

مرزا صاحب ۔ میرے خیال میں پہلے یہ طے کر لیجیے کہ نفع یا فائدہ کہتے کسے ہیں؟

میر صاحب ۔ میں تو فائدہ سے مراد یہ لیتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں راحت ملے، سکھ نصیب ہو۔

شیخ صاحب ۔ اور دُکھ دُور ہو۔ ورنہ ایک راحت اگر دس مصیبتیں اپنے ساتھ لگا لائی، تو یہ بھی کوئی علاج ہوا؟ اُلٹا اور وبال ہو گیا۔

میر صاحب ۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے، آگے چلیے۔

شیخ صاحب ۔ تو بس اپنے ہی قایم کیے معیار پر ان نت نئی کوششوں کو جانچ لیجیے۔ ریل کا نام آپ پیش کریں گے؟ اچھا اسی کو لیجیے۔ یہ فرمائیے کہ غلّہ کی مستقل گرانی جواب ہو گئی ہے، کبھی ریل کے دور سے پہلے بھی تھی؟

میر صاحب ۔ سبحان اللہ! ریل کا اس میں کیا قصور۔ ریل تو قحط زدہ علاقوں میں غلّہ پہنچا کر مصیبت ہلکی کر دیتی ہے۔

شیخ صاحب ۔ جی کیسی کچھ! اِدھر غلّہ کھیتوں سے کٹ کر آیا نہیں کہ اُدھر مال گاڑیوں میں بھر بھر کر باہر چلا نہیں۔ اور پھر مُلک کے اندر اُلٹ پُلٹ کرتا رہتا۔ جب بھی غنیمت تھا، یہ تو خدا معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے میں گرانی نہ ہو، تو کیا ہو؟

میر صاحب ۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ مسوری اور نینی تال اور شملہ آناً فاناً پہنچا دینا ریل ہی کا کام۔ ریل نہ ہوتی تو ہم ترسا ہی کرتے اور ان صحت بخش مقاموں کی ہوا بھی نہ لگنے پاتی۔

شیخ صاحب - اور ریل خود جو بیماریوں کا گھر ہے! یہ انجنوں کا بھکنکاتا ہوا دھواں آپ کے خیال میں بالا بالا چلا جاتا ہے؟ سانس پر، پھیپھڑوں پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا؟ نزلہ اس سے پیدا ہو جائے گلے میں خراش اس سے ہو جائے، کھانسی اس سے آنے لگے، دق اور سل کی بنیاد یہ پیدا کر دے۔ کوئی ایسی ویسی چیز ہے۔ کسی بڑے جنکشن پر ذرا کچھ دیر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھیے تو بادل کے بادل ہیں کہ دھوئیں کے چھائے ہوئے، جمے ہوئے۔ کپڑے الگ غارت۔ ہاتھ منہ الگ کالک میں لت پت۔ اور کوئلہ کے ذرّے ہیں کہ گھسے جا رہے ہیں آنکھ میں، کان میں! انجن والے بیچاروں کی وہ گت بن کر رہتی ہے کہ سبحان اللہ۔ اللہ نہ کرے دشمن کا بھی یوں منہ کالا ہو!

میر صاحب - اب اپنی ہی کہے جائیے گا، یا دوسرے کی بھی سنیے گا؟

شیخ صاحب - بات ابھی ختم کہاں ہوئی جو دم لوں۔ اپنی کالی کلوٹی کے گُن ابھی آپ نے پورے سُنے کہاں؟ اپنے کسی لمبے سفر کو یاد کر لیجیے۔ مسلسل جھٹکے اور دھچکے، اور کمر توڑ ہچکولے۔ انسان کو پیس کر چور چور کر کے، اعصاب چاہے فولاد کے بنے ہوں، جب بھی اُنھیں دھونس کر رکھ دیں۔ پھر رات کے سنّاٹے میں کوس کوس دو دو کوس کے فاصلہ سے سُن لیجیے کہ انجن گھڑگھڑاتا ہوا، دھک دھکاتا ہوا، زمین کا سینہ چیرتا ہوا چلا آ رہا ہے، جیسے جنگل کا کوئی دیو، چیختا، چنگھاڑتا، پھنکارتا ہوا آ رہا ہے۔ یہ آج جو اتنی کثرت سے عصبی اور خفقانی بیماریاں نکل پڑی ہیں، اِن میں کوئی ہاتھ ریلوے بازی کا نہیں؟ ذرا کسی بڑے محقق ڈاکٹر سے تو پوچھ دیکھیے۔

میر صاحب - غرض یہ کہ دنیا جہان کی ساری خرابیاں ریل میں آکر جمع ہو گئی ہیں۔

شیخ صاحب - ابھی کیا ہے، سُنتے جائیے۔ ہیضہ اور طاعون اور چیچک اور خدا جانے اور کون کون، آپ ہی کے ڈاکٹر کہتے ہیں، لگنی بیماریاں ہوتی ہیں

یہ ملک الموتی وبائیں کہ ابھی کلکتہ میں تھیں ابھی بمبئی پہنچ گئیں، ابھی مدراس میں نمودار ہوئیں، ابھی پشاور میں جانکلیں۔ یہ سب آپ کی ریلوے ہی کی برکت نہیں، تو اور کیا ہے! اور پھر یہ تو ہوئیں جسمانی بیماریاں۔ باقی جہاں جہاں پہلے پہل آپ کی یہ سواری بادبہاری پہنچتی ہے، وہاں اس کے جلو میں شراب خواری، ناچ گھر، اور کیا کیا نہیں پہنچتا؟ کچھ اس کی بھی خبر ہے؟

میر صاحب۔ اور فائدہ ان ساری برائیوں کے مقابلہ میں آپ کو ایک بھی نظر نہ آیا؟

شیخ صاحب۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ، پیروں کی قوت دن پر دن جواب ہی دیتی چلی گئی۔ باپ دادا تیس تیس چالیس چالیس میل کی منزل پیدل مارنے والے، صاحبزادوں کے سامنے نام ۸-۱۰ امیل کا بھی لیجیے تو اوسان خطا ہو جائیں۔ اور ایک ریل ہی کیا، آپ کے سائنس کو خدا سلامت رکھے، موٹر اور ٹرام، لاری اور سائیکل اور موٹر سیکل۔

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

اور پھر آپ کے کارخانہ کی خوشبوؤں کا کیا کہنا! جس آلہ کو اٹھا کر دیکھیے ربڑ کی بدبو سے ناک بس جائے، جس مشین کو چلائیے۔ پٹرول کی گندگی سے دماغ اڑ جائے۔ کیسی کیسی عطر بیز گیسیں، کیا کیا شامہ نواز ایسڈ اور تیزاب میرے شیر نے ایجاد کر ڈالے ہیں۔

مرزا صاحب۔ جی ہاں نفاست تو ختم ہے سائنس والوں پر۔ ان کی کسی لیبوریٹری میں، کسی فیکٹری میں جا نکلیے، ممکن رومال ناک پر نہ رکھ لینا پڑے۔ لیکن شیخ صاحب یہ آپ کی بھی زیادتی ہے کہ آپ سارا الزام ان ایجادوں ہی کے سر منڈھے دیتے ہیں۔ بیجا مصرف جس چیز کا بھی کیجیے وہ بری بن جائیگی۔ میرے خیال میں تو مشینوں کے استعمال کو صرف ضرورت کے وقت تک محدود کر دیا جائے، تو ان کے نقصانات گھٹ تو یقیناً جائینگے، چاہے بالکل دور نہ ہوں۔

میر صاحب - آپ بھی مرزا صاحب کس کی باتوں میں آ گئے - ہمارے شیخ صاحب تو وہ ہیں کہ دن دوپہر آفتاب ہی سے انکار کر بیٹھیں - آنکھوں میں خاک جھونکنا اور کہتے کسے ہیں؟ وہ دن بھول گئے، جب رات میں قدم گھر سے باہر نکالتے، تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے - یہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے کہ شہر کا ہر گلی کوچہ پڑا جگمگا رہا ہے، اور اب تو بجلی گاؤں گاؤں پہنچتی جا رہی ہے -

شیخ صاحب - جی ہاں وہی بجلی کے لیمپ نہ، جن کی شان میں حضرت اکبر قصیدہ خوانی کر گئے ہیں ؎

روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

یہ بھی خبر ہے کہ جب سے یہ روشنیاں نکلیں، خاص لندن کی گلیوں میں جرموں کی تعداد گھٹی نہیں اور بڑھ ہی گئی - لندن کی نائٹ لائف (شبانہ زندگی) پر تو مستقل کتابیں وہیں کے محققین نے لکھ ڈالی ہیں، کبھی ذرا انھیں اٹھا کر دیکھ لیا کیجیے "روشنی بیں اندھیر" کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے - اچھا جانے دیجیے، لندن اور پیرس کی اس تحقیق کو - ذرا یہیں کے کسی مبصر سے پوچھ دیکھیے، کہ اتنی تیز تڑپ کا اثر بصارت پر کیا پڑتا ہے؟ کیا خوب ترقی ہے! پہلے آنکھیں پھوڑ لیے، پھر آنکھ کے علاج کے لیے عینکیں خرید لیے! "روشنیِ طبع" کا بلا ہونا تو شاعروں کی زبان سے سنا تھا، اس روشنی برقی کا بلا ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں! ؎

لکھیگا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں اندھیرا ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں!

میر صاحب - آپ تو ہر سیدھی بات کو اُلٹی کر دیتے ہیں - لیکن میں بھی دیکھتا ہوں، کہاں تک ہٹ دھرمی سے کام لیے جائیگا؟ ایک اسی بات کو لے لیجیے، کہ جب تک یہ پانی کے نل نہیں لگے ہیں، سقّہ بہشتی کا رونا جھینکنا کیسا گھر گھر مچا رہتا تھا، اور اب وہی ہے، کہ بے محنت، بے کھٹکے، پانی چلا آ رہا ہے، ڈول رسّی کا جھگڑا، نہ پانی کھینچنے کی مشقت - مزے سے جب چاہا، بمبہ کھول دیا، نہا لیے، دھو لیے -

شیخ صاحب ۔ جی کیا کہنے ہیں واٹر ورکس کی برکتوں کے ۔ پانی تک ٹپ ٹپ اور تُل کر بکنے لگا! یہ حد ہے ترقیوں کی! جس دیس میں گلی گلی سبیلیں لگیں، اور جانوروں تک کے لیے پیاؤ چلا کریں، وہاں آج دو دن کی دیر ہو جائے، میونسپلٹی میں واٹر ٹیکس داخل کرنے کی، چلیے پانی بند! ترسا کیجیے حلق تر کرنے کو

مرزا صاحب ۔ اور یوں بھی تو پانی، وقت ہی وقت نل میں آتا ہے، اتنے گھنٹے صبح، اتنے گھنٹے شام۔

شیخ صاحب ۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ صاف شفاف، بہتا ہوا، کھلا ہوا پانی چھوڑ چھاڑ، بند، گھٹا ہوا، طرح طرح کی ترکیبوں سے پکے پکائے ہوئے پانی میں آخر جان ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اور گرمیوں میں تو بس مزہ ہی آجاتا ہے۔ وہ تپتے ہوئے بمبے، اور دہکتے ہوئے نل، اور کھولتے ہوئے پانی کی دھار۔ برف کا سہارا نہ ہو، تو حلق جھلس کر رہ جائے!

میر صاحب ۔ تو آخر برف کیوں نہ پیجیے؟ اب کیا ایسی نعمت پیسہ دو پیسہ سیر میں بھی مہنگی ہے؟

شیخ صاحب ۔ جی کیوں نہ پیجیے، بڑے شوق سے پیجیے، چاہے دانتوں پر، اور معدہ پر اور اعصاب پر جو کچھ بھی بیت جائے، آخر برف بھی تو ہے نہ سائنس کی پیداوار، اور مشینوں سے تیار ہونے والی نعمت!

میر صاحب ۔ خیر، وہ کچھ بھی سہی، یہ فرمائیے، کہ ایسے شان دار اسپتال اس دَور سے پہلے کب تھے، سامان راحت ہے بس، گھر سے بڑھ کر آرام دہ۔

شیخ صاحب ۔ اور یہ نئی نئی بیماریاں، عصبی اور دماغی اور ہر ہر طرح کی جو اَب نکل پڑی ہیں، ان کے نام تک بقراط و جالینوس نے کب سنے تھے؟ زہر خورانی کب اتنی عام ہوئی تھی؟ خودکشی کب آج کی طرح داخل فیشن ہوئی تھی؟ گندی سی گندی بیماریاں اپنے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی کب اس طرح انسان پر مسلط ہوئی تھیں؟ اور سب آڑے بگڑے ہوئے سائنٹیفک ایجادوں اور

آلوں کی ۔

مرزا صاحب ۔ اجازت ہو تو ایک اصولی بات میں عرض کر دوں ۔ مِل کے نام سے تو آپ دونوں واقف ہی ہیں ، وہی انگلستان کا مشہور فلسفی ۔ ایک جگہ لکھ گیا ہے کہ نیچر اور آرٹ کے درمیان نسبتِ تضاد ہے ، یعنی ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ میرے خیال میں کچھ ایسا ہی رشتہ نیچر اور سائنس کے درمیان بھی ہے ۔ گویا جو چیز زیادہ انسانی سائنس کی شرمندۂ احسان ہوگی ، اُسی قدر وہ طبیعی اور فطری حالت سے دُور ہوگی ۔ ہے یہ بات کہ نہیں ؟

میر صاحب ۔ یہ موشگافیاں تو میں جانتا نہیں ۔ سیدھی سی بات یہ دیکھتا ہوں کہ دوربینوں نے آسمانوں تک کو چھان ڈالا ہے ۔ یوں کہیے کہ ستاروں کی "مردم شماری" کر ڈالی ہے ۔ پھر یہ بھی سُن لیجیے کہ فلاں ستارہ اتنا بڑا ہے ، فلاں زمین سے اتنی دُور ہے ، فلاں کی رفتار فی منٹ اتنی ہے ۔ واللہ یہ عجائبات ہیں عجائبات !

شیخ صاحب ۔ عجائبات کیوں ؟ کہیے معجزات ہیں معجزات ! قصور معاف یہ نہ ارشاد ہوا کہ اس ستارہ نوردی اور آفتاب گردی سے آخر حاصل کیا ہوا ؟ انسانیت کی راہ کی کتنی منزلیں طے ہوئیں ؟ یہ مسافتیں اور پیمائشیں نہ معلوم ہوتیں ، تو انسان کی تکمیل انسانیت میں کونسی کسر باقی رہ جاتی ؟ وقت اور قوت کا صَرف بے حساب ، روپیہ کا خرچ بے شمار ، اور پھر ہاتھ کیا لگا ؟ مادی ؟ روحانی ؟ کچھ تو بتائیے ۔ اس لاحاصل دُوربینی اور ستارہ پیمائی سے تو ڈلیا ڈھونا اور گھاس کھودنا کیا بُرا ہے ؟

میر صاحب ۔ کیا خوب ! بس معلوم ہوگئی آپ کی قدر دانی ۔ یہ کوئی ترقی ہی آپ کے خیال میں نہیں کہ خاک نشیں انسان ہوا میں اُڑنے لگا ، طرح طرح کے اُڑن کھٹولے ایجاد کر لیے ، ملکوں ملکوں کی سیر آناً فاناً کر ڈالی آپ کے نزدیک یہ کوئی ترقی ہی نہ ہوئی !

شیخ صاحب ۔ اچھا تو معیار ترقی یہ ٹھہرا۔ مگر حضور والا، یہ ترقیاں تو آج سے نہیں، ہمیشہ سے حاصل ہیں۔ جنگل کی چڑیوں کو درختوں پر گھونسلا بنانے والے پرندوں کو، چیل اور کوّے اور گدھ اور کبوتر اور باز، سب ہی ہوا میں خوب فرّاٹے بھر لیتے ہیں، منزلوں کی خبر دم بھر میں لے آتے ہیں! حضرت انسان نے یہ بلند پروازی کے سبق جو کچھ سیکھے ہیں، انھیں جانوروں کو دیکھ کر سیکھے ہیں، یقین نہ آئے تو فن ہوا بازی Aviation کی جونسی کتاب چاہیے اُٹھا کر دیکھ لیجیے، یہ اقرار درج ملیگا۔

میر صاحب ۔ خیر، اب آپ سے مغز کون خالی کرے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ جیسے جیسے عجیب اور نادر آلاتِ جنگ آج جدید سائنس نے ایجاد کر لیے ہیں رستم اور بھیم کے تو خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہونگے۔

شیخ صاحب ۔ یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا سائنس کی اُستادی کا۔ واقعی بات ہے کہ خوب ہی سکھا دیا آپ کے سائنس نے بھائی کو بھائی کا پھاڑ کھانا، جسم کے ریشہ ریشہ کا قیمہ کر ڈالنا، ہاتھ، پیر، کان، آنکھ، ناک کے پرانچے اُڑا دینا، سانس کی راہ سے جسم کے پور پور میں زہر اُتار دینا! آپ سے زیادہ مانتا ہوں کہ یہ حصّہ ہے آپ کے سائنس کا! میں تو کہتا ہوں کہ یہ لطیف صنعتیں دیکھ کر جنگل کے شیر اور تیندوے، ریچھ اور بھیڑیے، سانپ اور اژدہے، سب اپنے کان پکڑ کر رہ گئے! کیا بات ہے آپ کے سائنس کی۔ بات کی بات میں انسان کو درندوں سے بڑھ کر درندہ بنا ڈالا۔

مرزا صاحب ۔ اور اصلی جوہر تو سائنس کا میدان جنگ ہی میں کھلتا ہے۔ اخباروں میں آپ نے پڑھا نہیں، کہ ایک صاحب کرۂ مریخ کے نہیں، اسی زمین کے، ڈون کی لینے پر آئے، تو بولے، خبردار، جو کوئی میرے قریب پھٹکا، خفیہ اور بے پناہ حربہ کا وہ ہاتھ دونگا کہ بھاگتے راہ نہ ملیگی۔ ادھر سے حریف کے ڈائرکٹر آف سائنٹفک ریسرچ نے گرج کر جواب دیا۔ کہ مردود، اس بھول میں نہ رہنا، یہ میرے محکمہ کے آٹھ سو سورما، نو ٹوبوں میں تقسیم اپنا

رات دن، کس دن کے لیے ایک کیے ہوئے ہیں؟ عین وقت پر وہ شگوفہ چھوڑونگا، کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیگی۔

شیخ صاحب۔ تو یہ کہیے،

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!

ہاں صاحب بڑھے جنوں کو اُتارنا کوئی دلگی ہے!

مرزا صاحب۔ میرے خیال میں تو گفتگو کو بہت طول ہو چکا۔ اب مجلس برخاست ہو، نہ ہو ہمارے میر صاحب بھی کچھ پریشان ہو چکے ہیں۔

میر صاحب۔ نہیں پریشانی کاہے کی، البتہ رہ رہ کر حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ ساری دنیا سے عنقا خیالات ہمارے شیخ صاحب ہی کے کیوں ہیں؟

مرزا صاحب۔ تو آپ کے خیال میں یہ بھی کوئی جرم ہے؟

شیخ صاحب۔ اور جرم ہو بھی تو بندہ تنہا مجرم ہے کب؟ رسکن اور کارپنٹر اور خدا جانے کتنے تو یورپ ہی میں میرے ساتھ ہیں۔ باقی رہا ہندوستان تو کم از کم گاندھی جی کے انڈین ہوم رول کے اُردو ترجمہ ہی دیکھ لیے جائیں۔

مرزا صاحب۔ لیکن میرے نزدیک تو کچھ زیادتی آپ کی بھی ہے، شیخ صاحب

شیخ صاحب۔ وہ کیا۔ کھُل کر کہیے نہ؟

مرزا صاحب۔ زیادتی یہی ہے کہ سائنس کو ایک سرے سے بُرا کہہ دیا جائے۔ اور مطلب تو غالباً آپ کا بھی یہ نہیں۔ سائنس کو دراصل جس چیز نے اتنا بدنام کر رکھا ہے، وہ اُس کا غلط اور بیجا استعمال ہے، نہ کہ سائنس بجائے خود۔ سائنس تو بس ایک قوت ہے۔ جیسے آگ، یا کسی پہلوان کا جسم۔ اب اگر پہلوان اپنی طاقت کو زور وظلم میں صرف کرنے لگے، تو یہ خطا پہلوانی کی نہیں، پہلوان کی ہوئی آگ کو قابو میں رکھیے، تو جو چاہیے، خدمت لے ڈالیے۔ اور وہی آگ اگر بے قابو ہو گئی، تو خود آپ ہی کو جلا ڈالیگی۔ یہی حال سائنس کا ہے، انسانیت کو اس پر حاکم رکھیے تو نعمت ہی نعمت، اور جو کہیں اس کو انسانیت پر حاکم بنا دیا، تو لعنت ہی لعنت۔

شیخ صاحب۔ اے تو زندہ باد! کیا خوب فیصلہ کر دیا۔ میں تو خود اسی نتیجے کی طرف لا رہا تھا۔ ہمارے ہاں کے حقیقت شناس تو صدیوں بیشتر یہی فیصلہ کر گئے ہیں۔ ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو کہیں آپ نے نفس کے تابع کر دیا، تو وہ سانپ اور اژدہا بن کر رہیگا، اور اگر عقل سلیم کے تابع رکھا تو اس سے بڑھ کر رفیق اور کون ؟

آب در کشتی ہلاکِ کشتی ست　　آب اندر زیر کشتی پشتی ست

پانی اگر کشتی کو اُٹھائے ہوئے ہے تو رحمت ہی رحمت، اور کہیں پانی کشتی کے اندر آگیا، تو ہلاکت ہی ہلاکت۔

مرزا صاحب۔ سبحان اللہ، ایسے عارفوں کے کلام کا کیا کہنا۔ اچھا تو اجازت ہے نہ ؟

میر صاحب۔ آداب عرض ہے۔

شیخ صاحب۔ خدا حافظ۔

حکمت

لفظ "قربانی" کی اگر تشریح نہ کی جائے، تو ہندو مسلم، سکھ اور جین، ہر مذہب کے ماننے والے اس کے قائل ملیں گے۔ اور اس کے کارِ ثواب ہونے پر سب متفق ہوں گے لیکن مسلمان جوں ہی اس کے اصطلاحی معنی کی بسلسلۂ عید اضحےٰ تشریح کریں گے، جین مذہب اسے ثواب سمجھنا کیا، شاید اس سے بڑھ کر کوئی گناہ بھی نہ سمجھیں۔ لفظ "کفارہ" کی جب تک تشریح نہیں کیجاتی عام وسیع معنی میں کوئی مذہب بھی اس کا منکر نہیں، لیکن جب اس کے یہ معنی بیان کیے جائیں گے۔ کہ حضرت مسیحؑ ساری نسل انسانی کی طرف سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو کر صلیب پر چڑھ گئے، تو بجز عیسائیوں کے اور کوئی بھی عقیدہ "کفارہ" کا قائل نہ ملے گا۔ لفظ "خودی" اپنے عام مفہوم میں خود بینی کے مُرادف، اور ہر گروہ کے نزدیک اخلاقی حیثیت سے مذموم ہے لیکن اقبال نے اسے روحانیت کے جس بلند مفہوم میں لیکر اپنی مثنوی میں استعمال کیا ہے، اس کے لحاظ سے یہی عیب ہنر بن گیا ہے۔

غرض، زبان میں اس طرح کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، کہ لفظ ایک ہی ہے لیکن مفہوم اس سے بالکل جدا جدا ہوتے ہیں، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ چند اشخاص یکجا ہیں، اور کسی مسئلے پر تبادلہ خیالات ہو رہا ہے، ہر شخص کا خیال اور مفہوم دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ لیکن اس خیال کو ادا کرنے کے لیے

سب کے پاس لفظ و اصطلاح ایک ہی ہے۔ دلیل کے ابتدائی حصے میں ہر شخص خوش و مطمین نظر آتا ہے، کہ دوسرا فریق بھی وہی کہ رہا ہے، لیکن آگے چل کر جوں جوں نتیجہ میں اپنے سے مختلف پاتا ہے۔ اس کی حیرت و حیرانی بڑھتی جاتی ہے، درحقیقت ہر فریق شروع ہی سے ایک جداگانہ خیال رکھتا تھا، جتنی دیر تک موافقت و ہمزبانی قائم رہی، وہ محض اس لیے کہ اصطلاح مشترک تھی حقیقت رسی کی راہ میں یہ ایک بڑا دھوکا ہے۔ اچھے اچھے نیک نیت طالبان حق کے قدم یہاں آکر پھسل جاتے ہیں۔ سچائی کی منزل کے ہر مسافر کو اس بڑے دھوکے اور خطرناک مغالطہ سے آگاہ رہنا چاہیے۔

لفظ "حکمت" بھی منجملہ انھیں لفظوں کے ہے جن سے آج ایک بڑی جماعت کو نادانستہ دھوکا ہو رہا ہے۔ آج علوم جدیدہ کی فرہنگ میں حکمت، انگریزی لفظ سائنس کا ہم مفہوم ہے، اور اس کا اطلاق تمامتر مادی و طبعی علوم پر ہوتا ہے۔ اجرام فلکی کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے، یہ علم ہئیت ہے۔ مادہ و قوت کے کیا ہیں اسے علم طبیعیات کہتے ہیں۔ اجسام کی ترکیب کیونکر ہوتی ہے اس کا نام کیمسٹری ہے۔ حیوانی زندگی کے نشو و نما کے کیا اصول ہیں، اسے بیالوجی سے موسوم کرتے ہیں۔ سطح زمین پر کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، اسے جیالوجی سے نامزد کرتے ہیں۔ اس قسم کے سارے مادی علوم، حکمت کے تحت میں آتے ہیں، اور جوں جوں کسی علم کے اصول، مشاہدہ و تجربہ کی گرفت میں زیادہ آتے جاتے ہیں، اسی قدر وہ "حکمت" کے معیار سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اس حکمت کا تعلق یکسر اس عالم سے ہے، جو اس ظاہری سے محسوس ہوتا ہے، اسی لیے جس ملک کی تعلیم گاہوں میں تجربہ و اختبار کا جتنا زیادہ اہتمام ہوتا ہے، اسی قدر وہ ملک، حکمت میں زیادہ کامل و ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مفہوم حکمت جدید کا ہے۔ حکمت قدیم میں بجائے مشاہدہ و تجربہ، اختبار، استقرا و عملیت کے، زیادہ زور قیاس، برہان، زبان و استدلال پر تھا۔ دائرہ بحث و نظر، جس طرح حکمت جدید کا کائنات ظواہر و محسوسات مادی تک محدود ہے،

حکمت قدیم کا بھی تھا۔ ذوق وحال کشف واشراق، معجزہ وکرامت، وحی والہام، حور وملک، ربوبیت ورحمانیت کے عالم سے جو بے تعلقی حکمت جدید کو ہے، حکمت قدیم کو بھی تھی۔

لفظ حکمت کا یہ وہ عام مفہوم ہے، جو آج "علمی دنیا" میں پھیلا ہوا ہے، لیکن یہی لفظ "حکمت" قرآن مجید میں بھی بار بار آیا ہے، اور موقع مدح پر آیا ہے، اور حدیث میں بھی اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس "حکمت" سے بھی ڈارون اور اسپنسر، ہکسلے اور ہیگل والی حکمت مراد ہے؟ کیا قرآن میں جس حکمت کا ذکر موقع احسان پر آیا ہے، وہ وہی ہے جس کی تعلیم یورپ کی یونیورسٹیوں اور جس کی سرپرستی امریکہ کی تجربہ گاہوں میں ہو رہی ہے؟ کیا جو حکمت آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کی بخشی ہوئی بہترین نعمت ہے، وہ وہی ہے جو وسیع کتبخانوں، اور عظیم الشان عجائب خانوں، پر تکلف تجربہ گاہوں اور بیش بہا آلات مادی کی محتاج ہے؟

سوال قرآن سے متعلق ہے۔ جواب بھی قرآن ہی سے لینا چاہیے کہ وہ کتاب مبین اپنے متعلق ہر سوال کا جواب شافی خود ہی دیتی ہے۔

لیکن قرآن کی زبان عربی ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ قرآنی کے معانی لغت عربی سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یہ بے شبہ ممکن ہے، کہ کسی لفظ کے وسیع وعام مفہوم کو، دوسرے مصنفین کی طرح قرآن نے اپنے محاورہ میں خاص ومحدود کر لیا ہو، لیکن اس کا امکان نہیں، کہ قرآن مجید میں کسی لفظ کا وہ مفہوم لیا گیا ہو، جس سے لغت عرب ہی سرے سے نا آشنا ہو۔ پس قرآن سے جواب حاصل کرنے کا پہلا مقدمہ یہ ہے، کہ زبان عرب میں اس لفظ سے کیا مفہوم سمجھا گیا ہے، اور ارباب لغت سے (خصوصاً ان سے جن کی نظر قرآن و حدیث پر بھی رہی ہے) اس باب میں کیا تصریحات منقول ہیں۔

جوہری نے اجمالاً صرف اس قدر کہہ دینے پر قناعت کی، کہ حکمت کے

معنی دانش اور ہر چیز کی حقیقت کے ہیں، اور حکم، جو حکمت کا مصدر ہے، اس کے معنی کسی کو بدی سے روکنے اور باز رکھنے کے ہیں (صحاح)

فیروز آبادی نے تفصیل کے چند قدم آگے بڑھا کر کہا، کہ حکمت سے مراد عدل اور علم اور حلم اور نبوت اور قرآن اور انجیل ہیں اور انسان میں حکمت اس کے چہرے کے اگلے حصے کو، اور اس کے سر کو، اور اس کے مرتبہ و اعزاز اور قدر و منزلت کو کہتے ہیں (قاموس)

مشہور ادیب اور نحوی، ابن درید کا قول، بغوی نے نقل کیا ہے، کہ ہر وہ کلمہ حکمت ہے، جو انسان کے حق میں موعظت کا کام دے، یا جو اسے کسی بھلائی کی جانب لیجائے، یا کسی برائی سے روکے (تفسیر معالم التنزیل) اور بعینہ یہی معنی، مفسر ابوحیان نے تابعی ابن زید سے نقل کیے ہیں (تفسیر بحر المحیط)

شارح حدیث، ابن اثیر کی تحقیق میں، حکمت نام ہے بہترین شئے کی معرفت کا بہترین علم کے ذریعہ سے۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ ان من الشعر لحکمۃ" تو اس میں حکمت سے مراد حکم ہے، اور حدیث کی تفسیر یہ ہے کہ بعض شعر کلام نافع ہوتے ہیں، جو نفس کو جہالت اور نافہمی سے باز رکھتے اور روک دیتے ہیں، اور حکم کے معنی علم، فقہ، اور عادلانہ فیصلہ کے ہیں اور حاکم کو حاکم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ظالم کو روکتا ہے، اور یہ ماخوذ ہے گھوڑے کے حکمت سے، جس کے معنی لگام کے ہیں اور حدیث عمر میں حکمت کے بلند کرنے سے مراد قدر و منزلت کے بلند ہونے سے ہے، (نہایہ، ملخصاً)

شیخ محمد طاہر نے اپنے جامع لغت حدیث میں ابن اثیر کے تتبع کیا تھا، کرمانی وغیرہ دوسرے شارحین کے بھی اقوال نقل کر دیے ہیں، آتاہ اللہ الحکمۃ سے مراد قرآن ہے، اور ہر وہ شئے جو جہالت اور برائی سے روکتی ہے۔ اور آتاہ الکتاب والحکمۃ میں کتاب سے مراد قرآن ہے، اور حکمت سے مراد علم ہے اور امور میں پختگی اور نبوت کے علاوہ اصابت حق اور حدیث حیا

میں حکمت سے مراد وہ علم ہے جس میں حقایقِ موجودات سے بحث ہو (مجمع
بحار الانوار)

ملا علی قاری، حکمت کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اس کے اصلی معنی ہیں،
جو چیز جو جہالت سے روک دے اور یہ مفہوم ماخوذ ہے حکمت بہ فتحتین سے
جس کے معنی لگام کے ہیں، جو گھوڑے کو بدکنے سے روکتی ہے۔ پس حکمت سے
مفہوم ہے وہ علم شریعت جو پختہ اور پکی حقیقت پر مبنی ہو۔ (شرح الشفا)

علامہ راغب کہتے ہیں، کہ حکم کے معنی ہیں اصلاح کے لیے روک دیا، اور
اسی سے جانور کی لگام کو نام حکمت پڑا۔ اور حکمت کا استعمال حسبِ ذیل معنی میں
ہوتا ہے علم و عقل کے ذریعے سے حق تک پہنچ جانا۔ حکمت جب خدائے تعالیٰ
کی جانب منسوب ہو، تو مراد ہوگی اشیاء کی معرفت اور ان کی ایجاد انتہائی
مضبوطی کے ساتھ اور جب انسان کی جانب منسوب ہو، تو مراد ہوگی موجودات
کی معرفت اور نکوکاری۔ اور حکمت سے مراد ہے قرآن کی تفسیر، اور جس کی
قرآن نے خبر دی ہے اس کی تشریح۔ اور ابن عباس کا قول ہے کہ مِن
آیات اللہ والحکمۃ میں حکمت سے قرآن کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ کا
علم مراد ہے اور ابن زید نے کہا ہے کہ آیات قرآنی اور ان کی باریکیوں
کا علم مراد ہے۔ اور سُدّی نے کہا ہے کہ حکمت سے مراد نبوت ہے اور
حکمت سے حقایق قرآنی کی فہم بھی منقول ہے۔ (مفردات ملخصاً)

سب سے زیادہ نکتہ سنجی اور دقیق النظری کے ساتھ محقق زبیدی نے
شرح قاموس میں نظر کی ہے، جس کا ملخص یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ
حکمت کے معنی، مثل حکم کے، فیصلے میں عدل کا ملحوظ رکھنا ہے، اور حکمت حقایق
اشیاء کے صحیح علم اور اس کے مطابق عمل کا نام ہے اور حق کو علم و عمل کے
ذریعے سے پا لینا حکمت ہے۔ اور آیہ کریمہ و لقد آتینا لقمان الحکمۃ میں
حکمت سے مراد شریعت کی تائید پر عقل کی شہادت کا قائم ہونا ہے۔

حکمت جب اللہ کی جانب منسوب ہوتی ہے، تو اس سے اشیاء کی معرفت اور ایجاد انتہائی پختگی کے ساتھ مراد ہوتی ہے، اور جب انسان کی جانب منسوب ہوتی ہے، تو اس سے اس کی اپنی معرفت اور عمل خیر مراد ہوتی ہے۔ اور حکمت، حلم کے معنی میں بھی وارد ہوئی ہے، جس کا مفہوم ہیجان غضب کے وقت طبیعت کو قابو میں رکھنے کا ہے۔ اور آیات کریمہ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ اور آتاہ الملک والحکمۃ اور آتیناہ الحکمۃ میں حکمت سے ہر جگہ مراد نبوت ورسالت ہے، اور حکمت کے معنی توریت اور انجیل اور قرآن کے بھی آئے ہیں۔ اور حکمت کے مفہوم میں علوم شریعت اور طریقت کے اسرار داخل ہیں۔ اور اسرار حقیقت الہیہ کے علم کا نام حکمت ہے۔ اور آیہ کریمہ یوتی الحکمۃ من یشاء میں حکمت سے فہم قرآن مراد ہے۔ اور حکمت کا اطلاق، اللہ کی طاعت اور دین کی سمجھ اور اس پر عمل اور فہم اور خشیت اور پرہیزگاری اور احکام الہٰی میں تفکر اور ان کے اتباع، سب پر ہوتا ہے (تاج العروس)

ان تمام بیانات کا لب لباب اگر مرتب کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ لغت عرب میں حکمت سے مراد یا تو کچھ صفات اخلاقی ہوتے ہیں، خواہ ایجابی شکل میں ہوں، مثلاً عدل، حلم، خشیت، تقویٰ وغیرہ، یا سلبی شکل میں ہوں، مثلاً برائی، جہالت اور بداخلاقی سے باز رکھنا۔ اور یا پھر اس سے مراد ایمان وعقیدے کی پختگی، اور معرفت نفس ومعرفت الہٰی ہوتی ہے، جس کا تعلق بلکہ، نبوت، تفصیل شریعت واسرار طریقت سے ہے۔ بس ان دو مفہوموں کے علاوہ کوئی اور مفہوم حکمت کا لغت عرب میں نہیں ملتا۔ جہاں کہیں مجازاً قدر ومنزلت وعزت مراد لی گئی ہے، سو یہ معنی بھی بدی سے رکنے اور نکوکاری ہی سے ماخوذ ہیں کہ عزت وشرف کا اصلی معیار نکوکاری ہے، محض غور وفکر، یا ذہانت وذکاوت، یا تجربہ ومشاہدہ، یا ایجاد واختراع، یا دلیل وبرہان، یا قیاس واستدلال، یا تمثیل واستقرآ، یا انتخراج واستنباط،

یا ترتیب مقدمات و تدوین کلیات، یا نقد و بحث کا کوئی مفہوم حکمت سے صراحتہً ہی نہیں، کنایۃً بھی نہیں نکلتا۔ پس جو مفہوم آج علمی دنیا میں حکمت کا سمجھا جا رہا ہے، اس مفہوم میں تو اس کے قرآن میں وارد ہونے کا امکان ہی نہیں۔ پھر آخر قرآن مجید میں یہ لفظ کن موقعوں پر، اور کس معنی میں وارد ہوا ہے؟

(۱) قرآن مجید میں پہلی بار یہ لفظ دعائے ابراہیمی میں آیا ہے۔ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جب اہل توحید کے لیے مرکز و معبد کی تعمیر سے فارغ ہو چکتے ہیں، تو اپنی نسل کے حفظ ایمان اور برکت اعمال صالح کے لیے بارگاہ حق میں مناجات کرتے ہیں، اور اس مناجات میں عرض کرتے ہیں، کہ

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیٰتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم (بقرہ ع ۱۵)	اے پروردگار انھیں میں سے ایک رسول پیدا کر جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک و صاف کر دے۔

امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے جس رسول کی پیدایش کے لیے دعا کی جا رہی ہے، اس کے ذریعے سے چار کاموں کے ہونے کی التجا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ آیتوں کو پڑھ کر سنائے، یہ کلام الٰہی کے ظاہر کا تحفظ اور الفاظ کی پیام رسانی ہوئی۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کتاب کی تعلیم بھی دے یعنی اس کی لفظوں کی تشریح کرے اور اس کی عبارتوں کے مفہوم سے انھیں آگاہ و باخبر کرے۔ چوتھا اور آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان کی روح و اخلاق سے ہر قسم کی آلائش و کدورت دور کر کے انھیں پاکی و پاکیزگی کے اس انتہائی درجے پر پہنچا دے جو انسانیت کا مقصود اعلیٰ ہے۔ دوسرے اور چوتھے یعنی تعلیم کتاب اور تزکیۂ نفس کے درمیان ایک مرتبہ تعلیم حکمت کا رکھا ہے۔ پس یہ حکمت قرآن کے مرادف نہیں بلکہ اس سے الگ کوئی شے ہے۔ پیمبر کا کام محض الفاظ کتاب کی تشریح کرنا نہیں، بلکہ اپنے پیرووں کے

دلوں میں اخلاقی زندگی کے ایک ایک جزئیہ اور تفصیل کا اتار دینا ہوتا ہے اور یہ کام وہ اپنے اسوۂ حسنہ اپنے ذاتی نمونے سے انجام دیتا ہے، پس سیاق کلام، فقرے کا مطلب یہ بتا رہا ہے کہ ان کے درمیان ایسا پیمبر پیدا ہو جو آیتوں کو پڑھ کر سنائے اور اُن کا مفہوم سمجھانے کے بعد، شریعت کے اسرار و رموز ان کے سامنے بے نقاب کر دے۔ اور ان میں دین کی سمجھ، اور روحانیت کی تڑپ پیدا کر دے۔ چنانچہ اکابر شیوخ تفسیر سے یہی معنی منقول ہیں۔[1] لیکن چونکہ پیمبر حقایق کی یہ تشریح و تفصیل اور پاکیزگی کی جانب رہنمائی، اپنی ذات کی بنا پر، وحی غیر مکتوب کے ذریعے سے کرے گا، اس لیے جن ارباب تفسیر نے اور زیادہ نکتہ رسی سے کام لیا، انھوں نے پیمبر کی ذات ہی کو مرکز بنایا، اور حکمت کا مفہوم سنت قرار دیا۔[2] یعنی وحی الہٰی کی وہ باریکیاں جو مکتوبی و ملفوظی صورت میں نازل نہیں ہوتیں لیکن جن سے پیمبر دوسروں کے شرح صدر سے کام لیتا رہتا ہے۔ حکمت کے اس مفہوم کو سائنس،

---

[1] ابن وہب سے روایت ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد دین کی معرفت اور دین کی سمجھ اور اور احکام دین کا اتباع ہے (ابن جریرؒ) حکمت، اُن معارف و احکام کا نام ہے جن سے نفوس کمال حاصل کرتے ہیں (بیضاویؒ) حکمت سے مراد دین کی سمجھ ہے (بغویؒ) بیاموزد ایشان را سرے و حکمتے کہ در ہر ہر حکم آن کتاب و ہر ہر لفظ آں کتاب مودع و مستور است تا علم ظاہر و باطن جمع شوند (شاہ عبدالعزیز دہلویؒ) علم کتاب سے مراد معانی و مطالب ضروری ہیں، جو عبارت سے واضح ہوتے ہیں، اور حکمت سے مراد اسرار مخفیہ و رموز لطیفہ ہیں۔ (شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

[2] قتادہؒ کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے (ابن جریرؒ) حسنؒ اور قتادہؒ اور مقاتل بن حیانؒ اور ابو مالکؒ وغیرہم کا قول ہے کہ حکمت کے معنی سنت ہیں (ابن کثیرؒ) حکمت یعنی سنت (بغویؒ) حکمت سے مراد وہ سنت ہے، جو کتاب میں مذکور نہیں (ابو حیانؒ)

اور علومِ مادی کے مفہوم سے کوئی بھی واسطہ ہے؟

(۲) دوسرا موقع وہ ہے جہاں اس دعاءِ ابراہیمی کی مقبولیت کا ذکر ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس طرح کا ایک رسول بھیجا گیا۔ یہاں ایک خفیف تغیر کے ساتھ تقریباً انھیں الفاظ دعا کو دہرایا ہے۔

كما ارسلنا فيكم رسولاً منكم يتلوا عليكم آيتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة (بقرہ ع ۱۸)

جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک و صاف کرتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

واضح ہے کہ یہاں بھی حکمت سے وہی مفہوم مراد ہے جس کی تشریح ابھی اوپر گذر چکی ہے۔

(۳) تیسرا موقع یہ ہے کہ طلاق کے احکام و مسائل اور ان کے جزئیات بیان کیے گئے ہیں، اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ان احکامِ الٰہی کو معمولی باتیں سمجھ کر ان کا ہنسی کھیل نہ بناؤ، یہ اللہ کی خاص عنایت و نوازش ہے، کہ اس نے الفاظ قرآن کے ذریعے سے نیز اس کی شرح و تفصیل اپنے رسول کے قلب پر القا کر کے اس کے ذریعے سے تمھیں تمھارے فلاح و بہبود کے یہ سارے مسائل تعلیم کر دیے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ ع ۲۹)

اور اللہ کے احکام کو ہنسی نہ ٹھہراؤ، اور اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، اور اس کو کہ اس نے تمھارے اوپر کتاب و حکمت نازل کی جس سے تمھیں نصیحت کرتا ہے۔

یہاں بھی حکمت سے کھلی ہوئی مراد تفصیلاتِ شریعت و توضیحاتِ قرآنی سے ہے، جو پیغمبر کے قول و فعل سے امت تک پہنچیں اور جس نے

۱؎ حکمت سے مراد وہ سنتیں ہیں، جو رسول اللہ نے تمھیں تعلیم دیں اور تمھارے لیے مقرر کر دیں۔

فرد و جماعت دونوں کی معاشری حالت میں اصلاح کر کے ایک اخلاقی انقلاب برپا کر دیا۔ رصد خانوں اور عجائب خانوں والی حکمت کو اس حکمت سے کوئی بعید تعلق بھی نہیں۔

(۴) چوتھی مرتبہ حکمت کا لفظ ایک نبی جلیل القدر حضرت داؤدؑ کے لیے آیا ہے ارشاد یہ ہے کہ داؤدؑ نے جالوت کے لشکر کو شکست دی، اور انھیں دنیوی سرداری کے ساتھ اس کے مقابل کی نعمت، "حکمت" یا دینی پیشوائی مرحمت کی گئی۔

وقتل داود جالوت واتاہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء (بقرہ۔ ع ۳۳)	اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا، اور اللہ نے انھیں بادشاہت اور حکمت عطا کی، اور جو کچھ چاہا اس کی انھیں تعلیم دی۔

اس کے قبل کے موقعوں پر "حکمت" "کتاب" کے مقابلے میں آیا تھا۔ اس کی تفصیلات شریعت یا سنت رسول کے معنی زیادہ چسپاں تھے، لیکن یہاں کتاب کے مقابلے میں نہیں، بلکہ مُلک (بادشاہت) کے مقابلے میں آیا ہے۔ دنیوی سرداری و حکومت کے مقابلے کی چیز دینی پیشوائی اور نبوت ہی ہو سکتی ہے، اور حضرت داؤدؑ نبی تھے ہی، اس لیے قرینہ کہتا ہے اور شیوخ تفسیر اس کی تائید کرتے ہیں، کہ حکمت سے مراد نبوت و رسالت ہے[۲]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ (ابن جریرؒ) حکمت یعنی سنت (ابن کثیرؒ) کتاب و حکمت سے مراد قرآن و سنت ہیں، اور دونوں کا ساتھ ذکر ان کے اظہار تعظیم کے لیے کیا (بیضاوی) کتاب و حکمت سے مراد قرآن و سنت ہیں (زمخشریؒ)

۲۔ سدی کا قول ہے کہ حکمت سے مراد نبوت ہے۔ (ابن جریرؒ) حسن کا قول ہے کہ امور کو ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر رکھنے کا نام حکمت ہے اور اس مرتبہ کا کمال نبوت ہی سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے حکمت کی تفسیر نبوت سے کی گئی ہے (بحر المحیط ابی حیانؒ) حافظ ابن کثیر، بیضاوی، زمخشری، بغوی، سب نے یہاں حکمت سے نبوت ہی مراد لی ہے۔

(۸) پانچواں موقع جہاں یہ لفظ وارد ہوا ہے، خاص طور پر اہم ہے۔ یہاں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے، کہ اللہ جسے چاہتا ہے، حکمت سے سرفراز کرتا ہے، اور جسے یہ نعمت حکمت مل جائے وہ بہت بڑی بھلائی کا مالک ہو جاتا ہے

یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا

(بقرہ - ع ۳۷)

اللہ جسے چاہتا ہے، حکمت دیتا ہے۔ اور جسے حکمت دی جائے پس بے شک اُسے خیر کثیر عطا کی گئی۔

اس حکمت کی تشریح خود کلام پاک ہی میں موجود ہے اوپر کی آیتوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت بیان ہو رہی ہے، اور یہ ذکر چلا آرہا ہے، کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو مال کا ضایع کرنا نہ سمجھو، اس لیے اپنا بہترین مال خرچ کرو، یہ نہ ہو کہ ردی مال اور کوڑا اٹھا کر صدقہ و خیرات میں دیدو۔ اور حکمت والی آیت سے معاً پہلے یہ آیت ہے۔

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلاً واللہ واسع علیم۔

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تمھارے ساتھ اپنی طرف سے مغفرت و فضل کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔

مادی عقل و فہم کا تقاضا یہی ہے، کہ روپیہ محض کار خیر میں لگانے سے ضایع ہو جاتا ہے اور تجارتی کاروبار میں لگا دینے سے بڑھتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس جذبے سے متاثر ہو کر سودی بینک وغیرہ قائم کرنے کی شیطانی تحریکیں برابر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ قرآن یہاں اسی وہم و خیال باطل کی تردید کر رہا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ یہ بالکل ناسمجھی کی بات ہے، سمجھ کی بات یہ ہے، کہ عقل حسی پر عقل ایمانی کو غالب کرو، اور پھر سمجھو، کہ مادی زندگی کے قانون سے اعلیٰ و ارفع بلند و برتر، قانون اخلاقی زندگی کا ہے۔ اللہ کی

مشیت ہیں جو اس کا اہل و لایق ہوتا ہے، اسی کو اس نکتۂ ایمانی، اس اصول دین کی فہم عطا ہوتی ہے، اور جسے یہ فہم ایمانی عطا ہو گئی، وہ بڑی سی بڑی بھلائیوں اپنی بزرگیوں اور دنیوی کامیابیوں کا صحابۂ کرام کی طرح مالک ہو جاتا ہے! پس حکمت کا صاف و صریح مفہوم یہاں اصولِ دینی و حقایق ایمانی کی فہم، اور اس پر عمل ہے۔[۱]

(۶) چھٹے موقع پر حضرت مسیحؑ کے ظہور کا ذکر بطور پیشگوئی کر کے یہ بیان ہے کہ وہ جب ظاہر ہوں گے تو

یعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل (آل عمران، ع ۵)	اللہ انھیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دے گا۔

یہ حکمت وہی ہے، جو سنن انبیاء کے مرادف ہے۔ پیغمبر اپنی امت کو اپنی سنت سے حکمت کا درس دیتے ہیں، لیکن خود انھیں یہ حکمت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ یہاں اسی کا ذکر ہے، اور حضرت مسیحؑ پر اللہ کی نوازشوں اور بخششوں کے سلسلے میں بتایا ہے کہ انھیں کتاب و حکمت و توریت و انجیل کی تعلیم براہ راست درسگاہ حق سے حاصل ہوگی۔

(۷) ساتویں مرتبہ لفظ حکمت اس سلسلے میں آیا ہے کہ انبیائے کرام کے ایک معاہدۂ قبل آفرینش دنیا، کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس موقع پر ان سے خطاب یہ وارد ہے، کہ تمھیں کتاب و حکمت کی آسمانی نعمتیں عطا ہوئیں ہیں۔

واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمۃ (آل عمران ع ۹)	اور جب اللہ نے انبیاء کا عہد لیا، کہ میں نے جو کچھ تم کو عطا کیا ہے کتاب و حکمت ہے۔

---

[۱] بعض مفسرین کرام کے چند تائیدی اقوال اوپر نقل کر دیے گئے، اور وہ آیندہ مواقع کے لیے کافی ہیں، ہر مرتبہ ان کے نقل کرنے میں غیر ضروری طوالت ہے۔

گویا انبیائے کرام پر آسمانی دو بڑی نعمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، ایک وحی مکتوبی وملفوظی، جسے کتاب سے موسوم کرتے ہیں، دوسرے ان کے اسرار کی شرح وتفصیل جو وحی خفی کے ذریعے سے پیمبر کے قلب اقدس پر نازل ہوتی رہتی ہے۔ اس حکمت سے صاف مراد علوم انبیاء ومعارف مرسلین ہیں۔

(۸) آٹھویں آیت حسب ذیل ہے،

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران، ع ۱۷)

بیشک اللہ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ انھیں میں سے ایک رسول اُن میں پیدا کیا، جو اُن پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے، اور انھیں پاک وصاف کرتا ہے، اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

شروع رکوع میں جنگ اُحد کا ذکر ہے، اور احکام رسول کی پوری فرمانبرداری نہ کرنے سے جو وقتی شکست ہوئی تھی، اس کی طرف اشارہ کرکے مرضی الہی پر توکل واعتماد کی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے، اور یہ بتانے کے بعد کہ (وما کان لنبی ان یغل) تمہارا رسول تو افضل انبیاء ہے، ان کی شان تو کہیں ارفع ہے، یہ تو کسی نبی کی بھی شان نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی اخلاقی عیب میں گرفتار ہو، یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کا یہ امت مسلمہ پر احسان عظیم ہے، کہ اس نے اُن کے درمیان ایسی حالت میں جبکہ وہ مدتوں سے اخلاقی نجاستوں میں آلودہ چلے آرہے تھے، ایک ایسا پاک نفس رسول مبعوث کیا، جو یہی نہیں، کہ اپنی ذات سے پاکیزگی کا مجسمہ ہے، بلکہ اپنی امت کو بھی پہلے الفاظ قرآنی پڑھ کر سناتا ہے، پھر ان کے تزکیۂ نفس پر توجہ کرتا ہے، اور پھر انھیں وحی مکتوبی نیز وحی خفی یا وحی غیر متلو کی تشریح کرکے تعلیم دیتا ہے، یہ حکمت، بھی فہم اسرار شریعت ودقائق تو حریت

مرادف ہے۔ اور وہی مفہوم رکھتی ہے، جس کی توضیح آیۃ (۱) و (۲) میں کی جا چکی ہے۔

(۹) نویں آیت میں یہ مذکور ہے کہ ابراہیم خلیلؑ دعا و آرزو کے مطابق ان کی اولاد پر نبوت کی جو برکتیں اُتاری گئیں، اُن میں ایک نعمت 'کتاب' کی ہے، اور ایک نعمت 'حکمت' کی۔

فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة (نسا ع ۸)	سو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت کی نعمت مرحمت کی ہے۔

ظاہر ہے، کہ نسل ابراہیمی جس شے کے لیے ممتاز رہی، وہ سلسلہ نبوت تھا، کہ اس نسل سے بیشمار انبیائے کرام اور خود سردار مرسلین پیدا ہوئے بیالوجی اور جیالوجی کے ماہرین فن، ریاضیات و طبیعات کے محققین اور دُوربین و خوردبین کے موجدوں کے لحاظ سے کبھی اس نسل کو شرف و امتیاز حاصل نہیں رہا۔

(۱۰) دسویں آیت میں براہ راست، نبی امیؐ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ

وانزل الله علیك الکتاب والحکمة (نسا ع ۱۲)	اللہ نے تیرے اوپر کتاب و حکمت نازل کی۔

اس حکمت کا نزول اُسی ہستی پر ہو رہا ہے، جو علوم مادی میں تحقیق و اجتہاد تصنیف و تالیف، ایجاد و اختراع تو کجا سرے سے پڑھنے لکھنے ہی سے ناآشنا ہے، اور شاید اپنا نام تک لکھنے پر بھی قادر نہیں! 'حکمت' کے اس مفہوم کو، آکسفرڈ و کیمبرج، برلن پیرس کی یونیورسٹیوں والی، کالجوں اور اکاڈمیوں والی، کتبخانوں اور عجائب خانوں والی 'حکمت' سے دُور کی بھی نسبت ہونی ممکن ہے؟

(۱۱) گیارہویں مرتبہ ایک اور نبی جلیل القدر حضرت مسیحؑ سے

خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے، کہ

واذ علمتك الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل (مائدہ۔ ع ۱۵)	اور جب ہم نے تجھے تعلیم دی کتاب کی اور حکمت کی اور توریت کی اور انجیل کی۔

یہ وہی مضمون ہے جو چھٹی آیت میں بطور پیشگوئی بیان ہو چکا تھا۔ اب یہاں اس پیشگوئی کے پورے ہونے پر پھر بیان فرمایا ہے۔ حکمت سے کھلی ہوئی مراد سنن انبیاء، فہم شریعت ہی ہے۔ حضرت مسیحؑ کسی مقالۂ محققانہ کے مصنف نہ تھے، کسی یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹری کی ڈگری عطا نہیں کی تھی۔ اہل علم کی کسی جماعت نے انہیں ماہر فن تسلیم نہیں کیا تھا، البتہ اُن کی اسی "حکمت" کے معجزات سے اہل عقل کی عقلیں عاجز رہ رہ جاتی تھیں۔

(۱۲) بارھویں موقع پر، حضرت ابراہیمؑ کے راہ راست پر ہونے کا ذکر، اور رسول کریمؐ کو ملت ابراہیمی پر قائم رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد، ارشاد ہوتا ہے کہ تنہا خود ہی اس دین حق پر قائم رہنا کافی نہیں، بلکہ خلقت کو بھی اسی راہ حق کی جانب دعوت دو، اور یہ دعوت، حکمت و موعظۂ حسنہ سے دو۔

اُدع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة (نحل۔ ع ۱۶)	بلاؤ اپنے پروردگار کی راہ کی جانب حکمت اور اچھے وعظ سے۔

دوسرے لفظوں میں، حکمت وہ شے ہے جس سے پروردگار کی راہ، دین ابراہیمی و دین محمدی کا راستہ ملتا ہے، نہ وہ شے جو طرح طرح کی مہلک ایجادات و اختراعات کی جانب لے جائے۔ اس حکم کے مخاطب اصلی رسول کریم صلعم تھے۔ حضورؐ نے ۲۳ سال تک برابر دعوت دی، مگر اس آیت کی تعمیل میں کسی ایک موقع پر بھی آپ نے کوئی دلیل، حکمت بہ مفہوم جدید کے لحاظ سے استعمال فرمائی؟ ایک دفعہ بھی ارسطو کی منطق اور افلاطون کے فلسفے کا حوالہ دیا؟ عادۃً نہ سہی، اتفاقاً بھی کبھی ریاضیات و طبیعات،

فلکیات وارضیات کے علوم وفنون سے استدلال کیا؟ یا اس کے برعکس اپنے خلق نبوی ہی کے ذریعے سے دعوت دیتے رہے؟

(۱۳) تیرھواں موقع وہ ہے، جہاں پورے دو رکوعوں میں شخصی وجماعتی، خانگی وملکی ہر شعبۂ زندگی سے متعلق حسن معاشرت واخلاق فاضلہ کے اصول بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

ذالک مما اوحیٰ الیک ربک من الحکمۃ (بنی اسرائیل ع ۴)	یہ اُن حکمت کی باتوں میں سے ہے جو تیرے پروردگار نے تیری جانب وحی کی ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کے رکوع ۳ و ۴ میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کن امور کی تعلیم دی گئی ہے۔ اشکال منطقی بتائے گئے ہیں، کیمسٹری کا کوئی فارمولا درج کیا گیا ہے، تاریخ کی ریسرچ، کی جانب رہنمائی کی گئی ہے؟ یا اس کے برعکس محض اُن اخلاق فاضلہ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے، جن کی تعلیم کے لیے ایک حرف ناشناس کو نبی اعظم بنا کر بھیجا گیا تھا؟

(۱۴) چودھویں مقام پر ایک بندۂ صالح حضرت لقمان کا (جو غالباً نبی بھی تھے) ذکر ہے، کہ انھیں حکمت عطا کی گئی، اور اس قانون حکمت کی پہلی دفعہ اللہ کی شکر گزاری تھی۔

ولقد آتینا لقمان الحکمۃ ان اشکر للہ (لقمان ع ۲)	اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی، کہ اپنے اللہ کا شکر ادا کرو۔

سارا رکوع اس اجمال کی تفصیل سے پُر ہے۔ شرک نہ کرو، والدین کی خدمت اپنا فرض سمجھو، نماز کی پابندی رکھو، صبر سے کام لیتے رہو، وغیرہ۔ سارے رکوع کا خلاصہ، اور "حکمت" کی تفسیر خود ہی یہ کر دی ہے کہ فلاح و بہبود، ترقی وکمال کا ذریعہ صرف تزکیۂ اخلاق ہے۔ "علوم وفنون" میں کمال پیدا کرنے کا اشارہ تک نہیں۔

(۱۵) پندرھویں آیت میں امہات المومنین ازواج مطہرات کو

خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ (احزاب ع ۴)	اور اُسے یاد رکھو جو تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور حکمت سے پڑھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ امت کی ان پاک ماؤں کے حجروں میں جس چیز کے چرچے رہتے تھے وہ قرآن پاک کی آیتیں یا رسول اللہ کے اقوال و اخلاق ہی تھے۔ منطق و فلسفہ، ہیئت و ریاضی کے درس نہیں ہوتے تھے۔

(۱۶) سولھویں نمبر کی آیت میں، چوتھے نمبر کی آیت کی طرح پھر ایک نبی جلیل القدر حضرت داؤدؑ کی جانب نعمت حکمت کو منسوب کیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ

وآتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب (ص ع ۲)	اور ہم نے انھیں حکمت اور حق باطل میں فیصلہ کرنے کا ملکہ عطا کیا۔

یہ قرآن ہی کی تصریح ہے کہ حضرت داؤدؑ اوّاب، اللہ ہی پر بھروسہ رکھنے والے ہر حال میں اسی کی جانب رجوع کرنے والے تھے، اور یہی اُن کی "حکمت" تھی۔ اُن کی حکمت کا بھروسہ قوانین فطرت پر نہیں، فطرت کے قانون ساز پر تھا۔

(۱۷) سترھویں آیت چھٹی آیت اور گیارھویں آیت کی طرح پھر حضرت عیسیٰ کا ذکر ہے، اور ارشاد ہوتا ہے کہ

ولما جاء عیسیٰ بالبیّنات قال قد جئتکم بالحکمۃ (زخرف ع ۶)	جب عیسیٰ کھلے ہوئے نشان لیکر آئے تو انھوں نے کہا میں تمھارے پاس حکمت لایا ہوں۔

لہ۔ اس آیت میں آیت اللہ سے مراد قرآن، اور حکمت، سے مراد سنت، ہونا خود صحیح بخاری میں قتادہؒ کے حوالے سے مذکور ہیں (کتاب التفسیر) اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس روایت کی دوسرے طرق سے تائید کی ہے۔ امام ابن جریر کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد وہ مسائل شریعت ہیں جو رسول اللہ پر قرآن کے علاوہ وحی ہوئے تھے، اور انھیں کا نام سنت ہے۔

یہاں حضرت مسیح کے پیغام کو حکمت سے تعبیر کیا ہے، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ آپ کا پیام کیا تھا، آپ کس شے کی تبلیغ کرتے تھے۔ یہ دعوت مادی علوم و فنون میں ترقی و کمال کی تھی، یا اس کے برعکس توحید و خداشناسی، تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کی تھی!

(۱۸) اٹھارہویں آیت میں گمراہ قوموں کا، اُن قوموں کا جو مادی زندگی کی محبت و مشاغل میں پڑ کر اخلاق، و روحانیت کے سبق کو بھلا بیٹھی ہیں، ذکر ہے اور یہ بیان ہے کہ اُنھیں سب طرح سمجھایا بجھایا ڈرایا جا چکا ہے، مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ولقد جاءهم من الانباء ما فيه مزدجر حكمة بالغة فما تغن النذر (قمر۔ ع ۱)	اُن تک آچکی ہیں وہ خبریں جنھیں تنبیہ ہے، حکمتِ کاملہ، مگر ڈراونیوں سے ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

یہ تنبیہ کرنے والی خبریں اور انجام کار سے خوف دلانے والی باتیں، اہل مکہ تک کیونکر پہنچیں؟ قرآن کے ذریعے سے یا رسول اللہ کی زبان سے پس حکمت بالغہ سے یہی چیزیں مفہوم ہو سکتی ہیں۔

(۱۹) انیسویں آیت میں ایک بار پھر، سب سے بڑے صاحب حکمت کی امیت اور حرف ناشناسی کو جتلا کر ارشاد ہوتا ہے کہ

هو الذى بعث فى الامیين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفى ضلال مبين (جمعہ۔ ع ۱)	وہی اللہ ہے، جس نے امیوں کے درمیان ایک رسول انھیں میں سے پیدا کر دیا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے گو وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے تھے۔

اُمی معلم کے چار فرائض، جس طرح شروع قرآن میں بتائے تھے، خاتمہ کے قریب پھر بیان کر دیے ہیں، اور ان فرائض میں تزکیۂ اخلاق کے بعد ہی

تعلیم کتاب و حکمت کو رکھا ہے، اور یہ سب کو مسلم ہے کہ رسول کریم ؐ نے اصلاح و تزکیہ کے جو فرائض انجام دیے، وہ اخلاقی ہی زندگی کے تھے۔

کلام پاک میں حکمت کا لفظ انیس آیتوں میں آیا ہے، اور ان کو پڑھ کر آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے، کہ حکمت سے محاورۂ قرآنی میں کیا مراد ہے؟ آیا وہ حکمت مراد ہے، جس کی شاہانہ عمارتوں میں نت نئے سائنٹفک انکشافات ہوتے رہتے ہیں، نئے نئے آلات ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ دوربین سے ستاروں کا معائنہ کرایا جاتا ہے، خوردبین سے ننھے ننھے ذرات کی تحلیل کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے، تاریخ کی "ریسرچ" کرائی جاتی ہے، "علوم و فنون" پر کتابوں کے انبار لگے ہوتے ہیں، اور ردّ و قدح بحث و دلیل، نقد و نظر کا بازار ہر لمحہ گرم رہتا ہے؟ یا اس کے برعکس وہ حکمت مقصود ہے، جو دلوں میں نیکی و پاکیزگی، حلم و ہمدردی، تسکین و اطمینان، خاکساری و فروتنی، ذوقِ عبادت و شوقِ جہاد، خلق کی خدمت اور خالق کی طاعت کی تڑپ اور بیقراری پیدا کرتی ہے، اور جس کا سب سے بڑا استاد، موجودہ معیار کے لحاظ سے، سب سے زیادہ اَن پڑھ اور حرف ناشناس ہوا ہے[1]

[1] اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے مولانا امیر علی مرحوم سابق صدر دار العلوم ندوہ، اس دورِ آخر میں فن حدیث و اسماء الرجال کے ایک محقق عالم اور علوم شرعیہ کے ایک فاضلِ اجل تھے۔ اردو میں ان کی تفسیر مواہب الرحمٰن کی تیس ضخیم و طویل و عریض مجلدات اُن کی وسعت نظر و تبحر کی زندہ یادگار ہیں۔ آیہ کریمہ یؤتی الحکمۃ من یشاء کی تفسیر میں کیا خوب فرما گئے ہیں:۔ "جاننا چاہیے کہ جو لوگ اس حکمت کو جو آیت میں مذکور ہے، علم ہیئت و افلاک پر محمول کرتے ہیں، اگر شاعرانہ کلام کے طور پر کہتے ہیں تو حرام و کبیرہ گناہ میں کوئی شک نہیں، اور اگر عمداً ہے تو کفر ہونا اقوی ہے۔ اور نہایت سخت برائی تو یہ ہے کہ اس کو حکمت فلسفہ یعنی یونانیوں کی فلسفی باتوں پر محمول کرتے ہیں، اور یہ کفر شدید ہے۔" (مواہب الرحمٰن، جلد ۳، صفحہ ۴۹)

ایک سوشلسٹ سے

اودھ کے ایک عالی خاندان نوجوان جو اپنی سوشلسٹ جماعت میں ایک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں، اُن کا ایک طویل مکتوب موصول ہوا ہے۔ چند ناگزیر لفظی ترمیمات کے بعد بجنسہٖ درج ذیل ہے:۔

مولانا محترم آداب۔

میں اُن لوگوں میں ہوں جو بچپن سے آپ کے خیالات کو پسند کرتے آئے ہیں۔ پہلے میں سچ پڑھا کرتا تھا اور پھر صدق۔ اب بھی جب کبھی نظر پڑ گئی تو آپ کی سچی باتیں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ آپ کے خلوص اور سنجیدگی کا قائل ہوں۔ مگر جس بات سے اب بھی مجھے سخت اذیت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ سوشلسٹوں سے ناراض ہیں مگر اُن کے خیالات کو سمجھ کر اُن پر تنقید نہیں کرتے۔ اسی طرح عیاشی اور آوارگی پر آپ کی لاعلمی بہت زیادہ ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ سوشلسٹ وہ لوگ ہیں جو اپنی بدمعاشی آوارگی کو چھپانے کے لیے اس نام کا لیبل لگا لیتے ہیں۔ یا وہ لوگ ہیں جو آپ کے ایسے بزرگوں کے پاک خیالات سے واقف نہیں۔ مگر کیا عرض کروں یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ دو چار نام کے سوشلسٹوں کو چھوڑ کر باقی جتنے ہیں سب کو اس کا لیبل لگاتے ہی وہ قربانیاں کرنی پڑتی ہیں جو معمولی آدمی برداشت بھی نہیں کر سکتا۔

آپ اسلامی طور پر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں زکواۃ خیرات وغیرہ کی مدد سے۔ لیکن آپ نے کبھی مزدوروں اور مِل مالکوں کے مسئلے پر غور نہیں فرمایا ہے کہ اسلامی طور پر ان کے جھگڑے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ طبقہ وار کشمکش کا حل سوا اس کے اور ہو ہی کیا ہو سکتا ہے کہ کارخانے مزدوروں کے ہو جائیں؟ اسی طرح کسانوں، زمینداروں اور برطانوی حکومت اور ہندوستانی رعایا کی کشمکش ہے۔ ان کی تحریروں سے میں صرف یہ سمجھ سکا ہوں کہ ان جھگڑوں کا حل یوں ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن اسے کون قائم کرے، اور کیوں قائم کرے؟ یہ ہو سکتا ہے کہ مل مالک زمیندار اور والیان ریاست باہم مل کر اسلامی حکومت قائم کر لیں، ہم لوگوں کے نزدیک ان میں یہ خواہش پیدا ہونا ناممکن ہے۔ لیکن اگر آپ کے خیال میں ممکن ہے تو ان کو نصیحتیں کیجیے۔ اپنا صدق ان کے پاس بھیجیے۔ لیکن آپ تو نصیحتیں کرتے ہیں غریبوں مزدوروں اور کسانوں کو۔

مزدور اور کسان بھی مل کر اسلامی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے کوئی راستہ چاہیے۔ اس وقت جو راستہ سامنے ہے وہ ہندو مسلم اتحاد، کسان سبھا، مزدور سبھا، کانگرس، اسٹرائک، لگان بندی، ستیہ گرہ کا راستہ ہے ان چیزوں کے بارے میں عملی اور نظری بہ کثرت تجربات ہیں، لوگ برابر تجربے کر رہے ہیں، اور کامیاب ہو رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس راہ چل کر جو حکومت قائم ہوگی، وہ عام ہندوستانیوں کی ہوگی نہ کہ اسلامی حکومت۔ آپ اگر اس پروگرام کو غلط سمجھتے ہیں تو کوئی دوسرا پروگرام پیش کیجیے جو واقعات پر مبنی ہو اور اس زمانے سے میل کھاتا ہو۔ اور اگر اس پر آپ کو پورا عقیدہ ہو تو تھوڑا سا عمل کر کے دکھایے

عیاشی اور زنا کے بھی آپ بہت خلاف ہیں۔ مگر اس میں بھی آپ کی نگاہوں میں راجہ صاحبان اور بہت اونچی بیسوائیں ہیں۔ آپ اوسط طبقے کے نوجوانوں کو بھول گئے۔ جو لڑکپن سے نوجوان اور نوجوان سے جوان اور پھر بوڑھے ہو جاتے ہیں، مگر کبھی اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ شادی کر سکیں،

اور ساتھ ہی ساتھ آپ شہوت کی طاقت کو بھول جاتے ہیں۔ بیسواؤں پر غور کرتے وقت آپ اُن کروڑوں تباہیوں کو بھول جاتے ہیں، جو دو دو آنے پر تین تین چار چار اندھے، لولے، کانے، بیمار، بدبودار مردوں کے ساتھ رات بسر کرتی ہیں۔ کیا ان کا پیشہ شہوت اور عیاشی کی وجہ سے ہوتا ہے؟

آپ اگر صرف جرائم خلاف وضع فطرت کے اسباب پر غور کریں تو بھی زنا کا مسئلہ کافی صاف ہو جاتا ہے۔ ان پر غور کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ زندگی میں گھس کر ذرا زندگی کے اُن طوفانی لہروں کا مطالعہ کیجیے جو انسانی جوہروں کو بات کی بات میں کیچڑ بنا دیتے ہیں جو شخص انسانی روح کی ان تباہیوں کو بھگت رہا ہو یا بھگت چکا ہو، اس کی نگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے آپ کی نصیحتوں کی۔ میں آپ کو سیکڑوں صحیح واقعات سنا سکتا ہوں، جن سے شہوت اور غریبی کا قریبی تعلق معلوم ہو سکتا ہے۔

غریبی کا مسئلہ تو شاید مولاناؤں کے ذہن میں بھی نہیں آتا۔ کیونکہ قناعت کا جوہر ان میں موجود ہے۔ لیکن آپ اُن لوگوں کو کیسے سمجھا سکتے ہیں جن کے ذہن میں ہندوستان کی ۴۰ کروڑ آبادی میں سے ۳۹ کروڑ کی برباد زندگی ہو، اور وہ محسوس کر رہے ہوں کہ قناعت کا جوہر دنیا میں کبھی اتنا نہیں پایا جا سکتا ہے کہ وہ ساری مخلوق کو خاموش کر دے۔ اور یہ کہ دنیا میں اگر ذرا سی قناعت اور بڑھ گئی تو بجائے امن اور اخلاق کے اور بد امنی اور بد اخلاقی پیدا ہو جائے گی کیونکہ قناعت سے جتنی زمین خالی ہو گی اس پر فوراً آل مالکان اور زمیندار اور سامراجی قبضہ کر لیں گے۔ میں اور تفصیل سے لکھتا لیکن مجھے یقین نہیں کہ ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہوگی، اس لیے خط ختم کرتا ہوں۔"

مراسلہ نگار صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ مکتوب الیہ کے لیے اظہار خیال کا ایک اچھا اور مناسب موقع بہم پہنچا دیا۔ سوشلزم سے متعلق اس کا مطالعہ وسیع یقیناً نہیں لیکن جتنا بھی کچھ ہے، شاید ناکافی و غیر وقیع نہ کہا جا سکے۔

کارل مارکس اور لینن کے خیالات، خود انھیں کی زبان سے جہاں تک انگریزی میں منتقل ہوئے ہیں، سن لیے گئے ہیں۔ برنرڈ شا وغیرہ انگریز سوشلسٹوں سے تو اور کچھ زیادہ ہی واقفیت ہے۔ روسی تجربے کی حکایت بعض صاحبانِ تجربہ ہی کی زبان سے سننے میں آچکی ہے۔ صنفیات وشہوانیات سے متعلق مطالعہ تو ایک حد تک وسیع بھی کیا جا سکتا ہے۔

سوشلسٹ طبقے کی قربانیاں نہ پہلے زیر بحث تھیں، نہ اب ہیں۔ گفتگو صرف سوشلزم کی تعلیمات کی صداقت کے باب میں ہے۔ اور قربانیاں حق و صداقت کی دلیل کسی معنی میں بھی نہیں بن سکتیں۔ اہل باطل نے باطل کی حمایت و نصرت میں ظاہر بیں نظروں میں، ہمیشہ اہل حق ہی کی طرح جوش وغلو، حمیت وغیرت دکھلائی ہے، بت پرستوں کا جوش وخروش بت پرستی کی حمایت میں اس سے کچھ کم ہوتا ہے جتنا اہل توحید کا توحید کے حق میں ہوتا ہے؟ ابولولو فیروز (قاتل حضرت عمر فاروقؓ) اور عبدالرحمٰن ابن ملجم (قاتل حضرت علی مرتضیٰ) نے کیا اچھی طرح جان بوجھ کر اپنے کو ذلیل ہلاکت میں ڈالا تھا؟ خود آج آپ آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ جرمن سپاہی کس بے جگری سے لڑ رہے ہیں؟ ہندوستان میں اکالی سکھوں نے اپنے "حقوق" کی حفاظت میں، اہل سنت لکھنؤ نے "مدح صحابہ" کی خاطر، شیعیان لکھنؤ نے تبرا کی حمایت میں، "خاکساروں" نے اپنے جھنڈے کی نصرت میں غرض کس نے جیل جانے، مار کھانے، گولی کھانے سے قدم پیچھے ہٹایا ہے؟ جب یہ صورت حال ہے، تو سوشلسٹ افراد کی قربانیوں کی داستان کچھ پھیکی سی پڑ جاتی ہے۔ آیندہ اگر پھر کبھی صدق میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کا اتفاق ہو تو گفتگو صرف سوشلزم کے اصول پر رہے۔ البتہ یہ تجربہ میرا ضرور ہے کہ جب کوئی تحریک داخل فیشن ہو جاتی ہے، تو اس میں زیادہ تر شریک ہونے والے وہی ہوتے ہیں، جو غور و تامل کی بنا پر نہیں، بلکہ فیشن یا زمانے کی ہوا ہی کی بنا پر شامل ہو جاتے ہیں۔ سوشلزم کی تحریک اس

کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہا یہ کہ کوئی تحریک خود داخلِ نیتش کیونکر ہو جاتی، اور چل کیونکر پڑتی ہے؟ سو اس کے اسباب کے تجزیہ کا موقع نہیں۔ اسباب مختلف ہوتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ ان میں حق و صداقت کا عنصر مطلق بھی شامل نہ ہو۔

یہ آپ نے سچ لکھا کہ صدقِ اصلاح حالات خالصتہً اسلامی اصول پر کرنے کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ اور اس کے تحت میں زکوٰۃ کی ادائی، صدقات کی تنظیم، جائداد کی عادلانہ تقسیم، سود کی حرمت، اسراف کی حرمت، چاندی، سونے، غلہ وغیرہ کی تجارتوں پر عادلانہ قیود، نیز دیگر مالی حقوق واجبہ کی ادائی کا اہتمام، قرضداروں کے حق میں آسانیاں، غرض اسلامی مالیات کا نظام پورے کا پورا آجاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ طبقہ دار کشمکش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی، جو آج، عطائیوں اور اناڑیوں کے علاج کی بنا پر، دنیا کے سر پر کابوس بنکر مسلط ہو گئی ہے۔ طبیب حاذق کا نسخہ پوری طرح موثر جبھی ہو سکتا ہے جب اس کے ہر جزو، اس کی ہر تدبیر اس کے بتائے ہوئے پرہیز اس کی تجویز کی ہوئی غذا غرض سب پر پورا عمل ہو۔ اسلامی نظام حکومت قائم ہو جانے کے بعد اول تو یہ بڑے بڑے کارخانے، یہ بڑی بڑی ملیں خود ہی زیادہ نہ رہ جائیں گی، اور اگر رہیں بھی تو اتنا تو بہر حال یقینی ہے کہ معاملہ "مالکوں" اور "مزدوروں" کے درمیان نہیں، بلکہ معاملت و معاشرت دونوں بھائیوں بھائیوں کے درمیان رہ جائے گی۔ جزئیات فقہ میں تو احکام یہاں تک ملتے ہیں کہ قلی سے اسباب اٹھوانا، کرایے کی سواری پر قدم رکھنا اس وقت تک جائز نہیں، جب تک قلی سے یا سواری والے سے اس کی مرضی کے مطابق اجرت طے نہ کر لی جائے۔ اور مزدوروں کے لیے تو حدیث میں صراحت ہے کہ ان کی اجرت فوراً ان کے حوالے کرو قبل اس کے کہ ان کی جلد کا پسینہ خشک ہونے پائے! یہ باتیں محض خیالی اور نظری نہیں۔ دنیا ان کا عملی نمونہ سالہا سال تک دیکھ چکی ہے۔ عثمانؓ جیسے غنی (آج کی اصطلاح میں "سرمایہ دار") اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے امیر کبیر

ایک ہی دسترخوان بے تکلف سلمان فارسیؓ اور عمار بن یاسر اور ابو الدرداؓ اور ابو ہریرہؓ کے ساتھ بیٹھتے تھے ——— آج رونا اس کا ہے کہ زمیندار کاشتکاروں کو پیسے ڈالتے ہیں۔ حالانکہ ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور عمر بن عبد العزیزؒ تو بادشاہوں کے مالک تھے اور ہر بڑے سے بڑے زمیندار سے کہیں زیادہ طاقت، اور حکومت و مقدرت رکھتے تھے۔ پھر وہاں بھی کبھی حکومت کے مظالم کا سخت گیریوں تشدد کا رونا رونا پڑا؟ یا یہ بات ہے کہ عرب میں آزادی خودداری کا احساس ہندوستانیوں سے کم تھا؟ اسلام کے حلقہ بگوشوں کو چھوڑیے اسلام کے نکتہ چین مورخ ان بادشاہوں کے طرز عمل سے متعلق کیا لکھ گئے ہیں[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح فطرت نے اپنے تمام شعبوں میں اختلاف و فرق مراتب قائم رکھا ہے، کوئی حسین ہوگا کوئی بدشکل، کوئی گورا کوئی کالا، کوئی دراز قد کوئی پستہ قامت، کوئی وجیہ کوئی کم رو، کوئی خوش الحان کوئی بد آواز، کوئی طاقتور کوئی کمزور۔ اسی طرح امارت و ثروت کا اختلاف بھی ایک حد تک ناگزیر ہے۔ کوئی امیر ہوگا کوئی غریب، کوئی حاکم ہوگا کوئی محکوم۔ سوشلزم، کمیونزم یا کوئی بھی "ازم" ہو جو اس تنوع کو مٹا دینا چاہتی ہے، دنیا کو تماشہ گاہِ کثرت کے بجائے جلوہ گاہِ وحدت بنا دینا چاہتی ہے، وہ فطرت سے جنگ کر رہی ہے۔ قرآن مجید کی حکیمانہ آیت "ولا تتمنوا ما فضل اللہ بعضکم علیٰ بعض" اسی جانب مشیر ہے۔ مراتب تکوینی میں شیونِ غیر ارادی میں اختلاف و تفاوت جزو فطرت ہے۔ البتہ اس کی بنا پر ظلم و تحقیر کا حق کسی کو نہیں۔ بہ اعتبار حقوق بشری سب برابر ہیں۔ انسانی مشینوں کے پرزوں کی طرح اس کائنات کی مشنری کا بھی ہر پرزہ اپنی جگہ پر اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہے، اور بڑے پرزہ کو ہرگز

---

[1] عمر فاروقؓ فرمانروائے حجاز و یمن و نجد و مصر و عراق و ایران و شام و فلسطین سے متعلق نولڈیکی (مشہور جرمن مستشرق) کے الفاظ ہیں **The Caliph lived Ashis Meaneal**

چھوٹے سے چھوٹے پرزہ کی بھی تحقیر کا حق حاصل نہیں۔ بس یہ نکتہ خوب ذہن نشین کرلیا جائے، تو سارے سوالات ازخود رفع ہو جاتے ہیں۔

شریعت فطری نے محض نظام مالیات پر قناعت نہیں کی۔ اخلاقیات، معاشریات، سب کے نظام الگ الگ مقرر کیے، سب ایک دوسرے کو زور تقویت پہنچانے والے۔ یہ تو فرنگیوں کا جاہلانہ فلسفہ "تنازع للبقا" Strugg for Existence کا ہے جس نے فرنگستان اور ہندوستان سب کے دماغوں پر مسلط ہو کر، سرمایہ داروں، سرمایہ شکنوں سب کے نزدیک ایک مستقل و مستمر صورت "کشمکش اور تنازع" کی مختلف طبقات انسانی کے درمیان ناگزیر بنادی ہے۔ اسلام نے اس تمامتر غلط و گمراہ کن فلسفہ ہی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اور وہ قائل "تنازع کا نہیں، "توافق للبقا" Alliance for Existence کے اصول کا ہے۔ اس نے جو "امت" کا تخیل قائم کیا ہے، اس میں سب ایک دوسرے کے حریف و رقیب نہیں، شریک و ہمدرد و غمگسار رہتے ہیں۔ امراء کا وجود اس کے ہاں اس لیے نہیں کہ وہ غصب کر کر کے امیر سے امیر تر ہوتے جائیں بلکہ اس لیے کہ اپنی دولت جتنی زیادہ غربا کے کام میں لگا سکتے ہوں لگائیں۔ بادشاہ رعایا پر "حاکم نہیں ہوتا، محض "راعی" ہوتا ہے، نگہبان، خبر رکھنے والا، ٹرسٹی، متولی۔ حاکم صرف حق تعالیٰ ہے۔ اور تو اور، بادشاہ قانون ساز تک نہیں۔ قانون ساز صرف اللہ ہے۔ اسلامی بادشاہ کا کام صرف انہیں قوانین الٰہی کا نافذ کرنا، اس انتظام الٰہی کو چلانا ہے۔ رعایا کا ہر فرد اس پر نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ فلاں امتحان پاس کر کے، فلاں مقدار جائداد کا مالک ہونے کے بعد ووٹ کا حق حاصل کر سکے اور سوال پھر بھی براہ راست خود نہ پیش کر سکے، بلکہ بالواسطہ کسی رکن مجلس قانونی کے ذریعے سے پیش کرائے اور پھر یہ نکتہ چینی ہر فرد کی طرف سے ہر وقت ہو سکتی ہے۔ بادشاہ پانچ وقت مسجد میں بہر حال آئے گا۔ بس وہیں بغیر کسی ضابطہ پرستی کے برسر عام سوال ہر شخص

کر سکتا ہے۔ اسلامی فرمانروا کے لیے مسجد ہی سب کچھ اسمبلی، کونسل، سینٹ، پارلیمنٹ کی سر بفلک عمارتوں کی تعمیر میں دولتِ قارون خرچ کر ڈالنا یہ سب داخل اسراف پھر بڑے سے بڑا بادشاہ بھی غیر مسئول نہیں۔ حاکم اعلیٰ کے سامنے، احکم الحاکمین کے حضور میں جوابدہی اور مسئولیت کی حیثیت سے اپنی ادنیٰ سی ادنیٰ رعایا کے بالکل برابر ـــــ غفلت کے دُور کرنے اور احساس ذمہ داری بیدار رکھنے کے لیے کوئی طریقہ اس بڑھ کر موثر ہو سکتا ہے؟

ساری امت میں اسی مسئولانہ ذہنیت کے پیدا کرنے اور ذمہ داری کی روح دوڑا دینے کے لیے کیا اچھا طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے کہ زور حقوق پر نہیں بلکہ تمامتر فرائض پر دیا۔ اور یہ مقام منجملہ اُن مقامات کے ہے، جہاں قانون اسلام کی بلندی تمام دوسرے قوانین سے، تمام انسانی شریعتوں سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے۔ آج سارے شر و فساد کی بنیاد بھی "حقوق طلبی" کا خبط ہے۔ لڑکے کہتے ہیں کہ ہمیں مدرسہ میں فلاں فلاں "حقوق" ملنے چاہیے اور نہیں ملتے۔ اس لیے ہم اسٹرائیک کرتے ہیں۔ بیویاں کہتی ہیں کہ خانگی زندگی میں ہمیں فلاں فلاں "حقوق" ملنے چاہیے اور نہیں ملتے، اس لیے ہم اعلان جنگ کرتے ہیں۔ غرض اجتماعی اور ذاتی دونوں زندگیوں کا ایک ایک شعبہ اسی حقوق طلبی کی بنا پر ایک مستقل رزم گاہ بن گیا ہے۔ یہ ان سے لڑ رہے ہیں وہ ان سے۔ یہ کہتے ہیں، ظالم تم ہو، وہ کہتے ہیں، اپنی طرف تو دیکھو، فلاں فلاں زیادتیاں تم نے کیسی کی ہیں! ـــــ ایک خانہ جنگیوں کا چکر اور تسلسل ہے، کہ برابر جاری اور قائم ہے! ـــــ اسلام نے حکم بڑوں کو دیا کہ اُن پر چھوٹوں کے ساتھ رحم و شفقت و ادائے حقوق فرض ہے۔ امیروں کو بتایا کہ غریبوں مفلسوں مسکینوں کی خبر گیری ان پر فرض ہے۔ شوہروں کو جتلایا کہ بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اُن پر فرض ہے۔ غرض امت کے ہر طبقے پر، ہر طبقے کے ہر ہر فرد پر فرائض کا لیبل ایسا چپکا دیا کہ اس کے بعد کوئی سوال کشمکش کا، مسابقت کا، ایک دوسرے کو کہنی مار کر پیچھے ہٹا دینے، گرا دینے کا باقی ہی نہیں رہ جاتا!

دریافت کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کونسا طبقہ قائم کرے گا؟

جواب میں عرض ہے کہ زردار Hanes اور نادار Houesnot دونوں مل کر۔ وہ حکومت سب کی ہوگی ہر طبقہ کا اس پر یکساں حق ہوگا۔ اور یہ طبقوں کا نام بھی تو آپ کے مذاق کی رعایت سے لیا جا رہا ہے، اور نہ حقیقۃً جس معنی میں "طبقہ" Lass کا لفظ بولا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے تو کوئی مستقل طبقات" امت اسلامیہ کے اندر ہونے ہی کے نہیں۔ جواہر لال اور دوسرے سوشلسٹ لیڈر بار بار Classlou Society کا نام لیتے ہیں، اس اسم کا مسمیٰ دنیا میں اگر پایا گیا ہے تو وہ امت اسلامیہ ہی تو ہے۔ یہاں کے سوا اور آپ کہاں جائیں گے، کہ امیر و غریب، نومسلم و قدیم الاسلام سب ایک ہی مسجد میں ایک دوسرے سے ملکر نماز کے لیے کھڑے ہوں، یہ نہیں کہ فلاں کے مندر میں فلاں نہ جاسکے اور فلاں کے مندر میں فلاں، گوروں کے گرجا الگ ہوں کالوں کے لیے الگ۔ یہ بات سوا یہاں کے اور آپ کہاں پائیں گے کہ "شریف" و "رذیل" اونچ نیچ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ کر ایک پلیٹ میں کھانا کھائیں، ایک گلاس میں پانی پئیں؛ یہ نہیں کہ ایک ایک ذات، اور ذات کے چوکے الگ الگ ہوں، اور ایک برتن میں کھانا اور پینا الگ رہا، ایک چوکے تک میں بھی بیٹھ سکیں۔ یا سپاہی کی مجال نہ ہو کہ کرنل کے ساتھ ساتھ ایک میز پر کھانے کے لیے بیٹھ سکے! یہ دستور سوا یہاں کے اور کہاں آپ کو ملے گا، کہ بڑے چھوٹے رئیس و مفلس ونن ایک قبرستان میں ہوں! یہ نہیں کہ ان کے قبرستان میں ان کا مردہ نہیں آسکتا، اور ان کے گورستان میں اِن کا!

اسلامی حکومت قائم کرنے میں معین و شریک ہر وہ فرد ہوگا جسے اپنا اسلام عزیز ہے۔ اور غربا کا طبقہ قدرتاً اس میں پیش پیش ہوگا، جیسا کہ اس کے قبل ہر اصلاحی و ربانی تحریک میں ہوتا آیا ہے۔ صدق کے پاس اس کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں۔ اور یہی پیام وہ پہنچاتا رہتا ہے طبقۂ امراء سے زیادہ

طبقہ عوام و غربا میں امرا میں تو اس کے خریدار دس ہی بیس ہوں گے، باقی پچاسوں اور سیکڑوں کی تعداد میں وہ عوام اور غربا ہی کے ہاتھ میں پہنچا رہتا ہے اس کی نصیحتیں "جو بھی کچھ اور جیسی بھی کچھ ہیں" والیان ریاست اور قلی و مزدور سب کے لیے یکساں کھلی ہوئی ہیں۔ یہی ایک پروگرام ایسا ہے، جو "واقعات اور واقعیت پر مبنی ہے" اور "اس زمانہ اور ہر زمانے سے میل بھی کھاتا ہے"۔ رہا اس پروگرام پر خود مدیر صدق کا عمل، سو اُسے اپنی بے عملی اور نااہلی کا تو پورا اعتراف ہے، پھر بھی توفیق الٰہی جتنا بھی ساتھ دے جاتی ہے، ایک محدود وادنیٰ پیمانہ پر عمل ہوتے ہی جاتا ہے۔ مشاہدہ و ذاتی علم کی ضرورت آپ سمجھیں تو بمسرت تمام دو چار روز، دو چار ہفتے، جتنا چاہیں قیام فرما سکتے ہیں۔ کوتاہیاں آپ کو اس کے عمل میں یقیناً ملیں گی، لیکن ایسی کوتاہیاں تو، نماز روزہ ہر شعبۂ عبادات میں ملیں گی۔ اس عمل کے لیے "میدان" اور پبلک پلیٹ فارم مطلق ضروری نہیں۔ ہر فرد خاموشی کے ساتھ اپنی بساط کے موافق اپنی محدود خانگی زندگی کے اندر اس راہ پر چل کر اس کا عملی نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

دوسرے پروگراموں کی جانب جو اشارہ کیا گیا ہے، وہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ کیا یہ بھی ضرورت ہے کہ ان پروگراموں کی عملی اور نظری کمزوریوں کو کھول کر بیان کیا جائے؟ اب بیس سال تو تجربے کے ہو گئے۔ انتشار، اندرونی انتشار اتنے دنوں میں کچھ گھٹا کہ اور بڑھ گیا؟ کانگریس اور مخالف کانگریس تحریکات کی ٹکر کو چھوڑیے خود کانگریس کے اندر کتنی پارٹیاں اور پارٹی در پارٹی پیدا ہو چکی ہیں؟ کیسی کیسی ایک دوسرے سے بدگمانی رکھنے والی، ایک دوسرے پر الزامات لگانیوالی کوئی مہینہ مشکل سے گزرتا ہے کہ کسی نئے شقاق و اختلاف کی خبر نہ شایع ہوتی ہو۔ اور یہ سب بالکل قدرتی ہے۔ اس لیے کہ بجز ستیہ گرہ کے، کہ وہ تو ناقص سہی بہر حال ہے ایک اخلاقی و روحانی تحریک، باقی اور سب تحریکات کی بنیاد بجز حُب جاہ، حب ذات اور دنیا پرستی کے اور کس چیز پر ہے؟ نتائج وہی نکلنے ہی تھے، جو نکل رہے ہیں۔

اسلام کا ظاہری قانون ہزار مکمل سہی، اس کا مالی نظام لاکھ حکیمانہ سہی، اس کی تقسیم دولت کیسی ہی عادلانہ سہی، مفاسد کے سدباب اور شر و مضرت کے انسداد کے لیے ضروری تھا کہ ان مادی قوانین کو مدد اور قوت پہنچائی جائے اخلاقی قوت سے۔ اور ایک بڑی اخلاقی قوت کا نام قناعت ہے۔ اور اسلام نے اس کی تربیت کا خاص اہتمام کیا ہے۔ قناعت ضد ہے ہوس کی، اور قناعت نام ہے ضبط ہوس کا۔ ایک بہت سادہ اور آسان سی ریاضت نفس ہے خدا معلوم آپ نے اسے اس قدر دشوار کیوں سمجھ لیا۔ ہمت اور قوت ارادی اگر سرے سے صرف ہی نہ کی جائے تو دنیا کی ہر آسان سے آسان چیز مشکل ہے، ورنہ تھوڑی سی صرف ہمت کے بعد قناعت کچھ بھی دشوار نہیں رہ جاتی، ۴۰ کروڑ میں سے ۳۹ کروڑ کے لیے کیا معنی، کسی ایک متنفس کے لیے بھی نہیں۔ پھر قناعت کا یہ تصور بھی بہت عجیب قسم کا ہے کہ "قناعت سے جتنی زمین خالی ہوگی، اس پر قبضہ مل مالکان اور زمیندار اور سامراجی کریں گے"۔ اگر مالکان مل و زمیندار وغیرہ اتنے قسی القلب تسلیم بھی کر لیے جائیں کہ ان کے دل قناعت کا سبق از خود لے ہی نہیں سکتے تو کیا مزدوروں، کاشتکاروں وغیرہ کی قناعت کی برکت بھی بالکل بے اثر ہو گی کم از کم انھیں غربا کی قناعت متعدی ہو کر ان شاء اللہ پتھر میں جونک لگا دے گی۔

جس طرح دین اور شریعتیں صرف دو ہی ہیں، ایک توحیدی، دوسری لاتوحیدی، اسی طرح حقیقۃً تمدن و تہذیب کی بھی دنیا میں کل دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں، وہی ایک توحیدی، دوسری لاتوحیدی۔ یہ دین وحدت دین توحید صرف ایک ہے جس طرح خط مستقیم صرف ایک ممکن ہے، اور یہ دین اپنی ایک مخصوص تہذیب، مخصوص تمدن، مخصوص قانون رکھتا ہے۔ اس کے مقابل لاتوحیدیت بے شمار مظاہر رکھتی ہے، جس طرح خطوط منحنی بے شمار ہو سکتے ہیں صحت صرف ایک شے کا نام ہے، عدم صحت یا بیماری کی صورتیں صدہا ہزارہا ہیں۔ لاتوحیدیت اپنے اندر باطل کی بے شمار صورتیں رکھتی ہیں، اور شرک، الحاد، تحریف دین کے

تمام مظاہر پر شامل ہے اس کی تہذیبیں اور اس کے تمدن بھی کثیر اور متعدد ہیں۔ لیکن ایک چیز سب میں مشترک ملے گی، یعنی اعتدلال کے قانون حکمت سے ہٹا ہونا۔ مسائل حیات پر نظر اُن کے اندر ہمیشہ کسی ناقص اور محدود ہی پہلو سے ہوگی۔ ہمہ جہتی نقطۂ نظر ان کے نصیب میں ہی نہیں۔

یہ لاتوحیدی یا باطل تہذیبیں چونکہ زندگی کی غلط تفسیر، مسائل کائنات کی غلط تعبیر میں ہوتی ہیں، اس لیے ان کے فتنوں اور رخنوں کے امکانات بہت زائد اور قوی رہتے ہیں۔ یہ ایک غلطی کی اصلاح دوسری غلطی سے کرنا چاہتی ہیں۔ گویا ایک بیماری کو دور کرنے کے لیے دوسری بیماری مسلط کر دیتی ہیں اس سے غلطیوں، گمراہیوں، بیماریوں کا ایک دور و تسلسل قائم ہو جاتا ہے، اور صحت و اصلاح کی منزل جوں کی توں دور رہتی ہے۔ تقسیم دولت کے معاملے میں بھی بنیادی غلطی یہ ساری باطل تہذیبیں کرتی آئیں، اور آج بھی کر رہی ہیں۔ افراد کے درمیان دولت کی نامساوی تقسیم ایک مشاہدہ اور واقعہ ہے، اس سے تو کسی کو انکار ہی نہیں۔ سوشلزم اور کمیونزم کی لاتوحیدی تہذیب نے اس کا علاج حسب معمول سطح بینی سے کام لے کر یہ تجویز کیا کہ ذاتی ملکیت کو مٹا دیا جائے اور دولت کو افراد کے ہاتھ سے نکال کر اسٹیٹ (حکومت) کی طرف منتقل کر کے، افراد کو اس کا مساوی حصہ دار بنا دیا جائے ـــــ یہ علاج بالکل ایسا ہی "عطائیانہ" ہے، جیسے کوئی عطائی کسی مریض کو شدید بخار میں جلتے جھلستے دیکھ کر نہایت شفقت و ہمدردی سے یہ تجویز کرے، کہ مریض کو خارجی ذرایع سے خوب ٹھنڈ پہنچاؤ، پنکھا جھلو، ٹھنڈا پانی جسم پر ڈالو، اس سے گرمی مٹ جائے گی!

شریعت اسلام نے اس کے برعکس، مرض کے اصل اسباب اور حقیقی نوعیت پر نظر کی، اور حسب معمول حکیمانہ وقتِ نظر سے کام لے کر نظام معاشرت ہی ایسا رکھ دیا، جس میں ایک جگہ اجتماع دولت کی نوبت ہی حتی الامکان نہ آئے، اور اگر

کہیں آ جائے، تو اس کے مفاسد تو بہر حال رونما نہ ہونے پائیں۔ ایک طرف تو اس نے ذاتی ملکیت، شخصی جائداد کا حق پوری طرح تسلیم کر کے انفرادی جد و جہد کو جاری رہنے کا پورا موقع دیا، دوسری طرف سود کو ہر صورت اور ہر حال میں حرام قطعی قرار دے کر نظام سرمایہ داری کی جڑہی کاٹ دی، پھر ترکہ و وراثت میں جائداد کی تقسیم عادلانہ رکھی۔ محروم کسی وارث کو بھی نہیں رہنے دیا۔ زرداروں پر ناداروں کی امداد فرض کر دی، یعنی یہ امداد ناداروں پر کوئی احسان نہیں، اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں، جسے وہ قبول کرتے شرمائیں۔ یا اس کی بنا پر زرداروں میں کوئی جذبۂ افتخار پیدا ہو اور ان سب کے علاوہ دولت و ثروت کو ایک امانت الٰہی کا مرتبہ دیا۔ اسراف نمائش نفس پرستیوں کو دین و اخلاق کی عدالت میں مستقل جرم قرار دیا۔ اس طرح دولت کی "مساویانہ" تقسیم کی غلط کوشش کے بجائے اس کی عادلانہ تقسیم پر زور دیکر بجائے ایک جھگڑے اور مخاصمت کی چیز رکھنے کے اُسے خلق کے حق میں ایک نعمت اور رحمت بنا دیا۔

اسلام کی حکیمانہ شان، مسئلہ دولت و ثروت سے بھی کچھ بڑھ کر، مرد و عورت کے تعلقات جنسی کے باب میں نظر آتی ہے۔ مرد کی شہوانی قوت کی طاقت کو اسلام بھولا ہرگز نہیں ہے، اس کی تو اُس نے اپنے قانون میں ہر جگہ رعایت رکھی ہے، اور اپنے نظام معاشرہ میں ہر قدم پر اس کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ بلکہ اب تو اکثر نافہموں کی طرف سے اس پر الزام ہو رہا ہے، کہ اس نے اس کی اہمیت ضرورت سے زائد ملحوظ رکھی ہے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں الزامات بے بنیاد ہیں۔ افراط و تفریط کی ہر کجی اور کج روی سے بچ کر اس نے ٹھیک اسی نقطۂ اعتدال کو اپنا مقام بنایا ہے، جو فطرت بشری اور نظم کائنات کے عین مطابق ہے۔

ایک طرف تو اس کے احکام مردوں، عورتوں دونوں کو یہ ہیں کہ اپنی نگاہیں

مستثنیٰ صورتوں کے لیے مستثنیٰ تدبیریں اور مشورے بھی حدودِ شریعت کے اندر ہی مل جائیں گے مثلاً اگر کوئی شخص اتنا مفلس ہے کہ بیوی کا بار اٹھا ہی نہیں سکتا ساتھ ہی فطری جذبات کا تقاضہ بھی ہے۔ ایسے شخص کو حدیث میں مشورہ یہ دیا گیا ہے کہ مسلسل روزہ رکھے، فَعَلَیْهِ بِالصَّوْمِ تجربہ شاہد ہے کہ مسلسل روزوں سے کسرِ شہوت ہو جاتا ہے، اور صحت کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح دوسری استثنائی صورتوں کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ حرام کاری پر مجبور ہو جانے کی کوئی صورت ہی نہیں، نہ مرد کے لیے نہ عورت کے لیے تو نکاح کی صورت کا کھلا ہونا ظاہر ہی ہے، باقی ادنیٰ درجے والیوں کے لیے بھی، اسلامی معاشرہ (سوسائٹی) میں عصمت فروشی کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اسلام نے چونکہ عورت کے سر گھر کی ذمہ داریاں، خانہ داری کا انتظام، اور نسلِ انسانی کی پرورش و تربیت کا بار ڈالا ہے اس لیے کسبِ معیشت سے اسے بالکل آزاد رکھا ہے۔ کما کر لانا اور گھر والیوں کو کھلانا فرض مرد کا ہے یعنی شوہر کا، باپ کا، بھائی کا بیٹے کا یا اور کسی ولی جائز اور افسرِ خاندان کا۔ اور جن شاذ صورتوں میں عورت ان ساری نعمتوں سے محروم ہو، وہاں اسلامی حکومت میں تو خود حکومت کی طرف سے اس کی خبر گیری کیجائے گی، اور بدقسمتی سے جہاں اسلامی حکومت نہیں، وہاں ابھی ایسی بدنصیب عورت، محلہ کی، پڑوس کی، شریف زادیوں کے واسطے سلائی وغیرہ کا کوئی ہلکا کام بسر اوقات کے لیے اختیار کر سکتی ہے۔ آخر ہندوستان میں جو مفلس عورتیں ہیں۔ کیا وہ سب کی سب اپنے جسم ہی کو کرایہ پر چلا کر ناپاک اور گندی آمدنی پیدا کرتی رہتی ہیں؟ اس نسائیت کو ذلیل و رسوا کرنے والے پیشے میں پڑنے کی مجبور کن صورت، تو موجودہ غیر اسلامی حکومت میں بھی، شاید ہی کوئی پیش آسکے، اور نظامِ اسلامی کے بعد تو قطعی کوئی گنجائش ہی اس کی نہ رہے گی۔

محض خیالی اور نظری مباحث پر اکتفا نہ کیجیے۔ نظر واقعات و مشاہدات پر رکھیے۔ کیا عہدِ خلفائے راشدین میں مفلس عورتیں تھیں ہی نہیں؟ اسلامی نظامِ معاشی نے ان کی تعداد اس میں شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ گھٹا دی تھی، تاہم کچھ تو

تھیں ہی۔ پھر وہ تو کوئی بھی اس گندہ پیشہ پر مجبور نہ ہوئیں؟ خود آج کیا نجد میں، یمن میں، حجاز میں افلاس کا وجود نہیں ہے، بایں کتنی تعداد وہاں جیسواؤں کی ہے؟ بیسوائی کی تاریخ (ہسٹری آف پراسٹیٹیوشن) پر اسکاٹ، بلوشن، وغیرہ کی تصنیف کی ہوئی متعدد کتابیں موجود ہیں، اُن کا مطالعہ فرمایا جائے پیشے کے اسباب و محرکات، افلاس و بے زری نہیں، عموماً دوسرے ہی دوسرے ملیں گے۔ ہندوستان میں تو یہ پیشہ ــــــ مسلمان ناظرین کیسے یقین کریں گے؟ ــــــ ایک زمانے میں مقدس رہ چکا ہے۔ بہت سے مندروں میں "دیو داسیوں" کا وجود اب تک اس عقیدے کو زندہ کیے ہوئے ہے۔ انگلستان، فرانس، امریکہ، اور خود سوویٹ روس میں بیسوائی کا جو زور ہے (خواہ بہ حیثیت پیشہ ہو یا محض شوقیہ اور اب تو زیادہ تر شوقیہ ہی ہے) اس کا حال ایک دو نہیں، اُن متعدد تصانیف میں ملاحظہ فرما لیا جائے، جو وہیں کے محققین نے، مردوں، عورتوں دونوں نے شائع کی ہیں۔ غریب مشرقی تو ان و طلسم ہوشربا ؤں" کو پڑھ کر محض دنگ و ششدر رہ جاتا ہے۔ کیا یہ ممالک مفلس ہیں؟ کیا افلاس یہاں حرام کاری کی جانب لا رہا ہے؟ کیا یہاں اسباب و موثرات میں، شراب خواری، کوکین، ہیروئن وغیرہ دوسری قسم کی نشہ بازی، مردار خوری، سوٴر وغیرہ حرام اور گندے جانوروں کو کھانا، بے پردگی، بے ستری، ہم تعلیمی، فلمی، اور ناچنے گانے بجانے کا زور، فحش تصویریں، آرٹ وغیرہ شامل نہیں؟

عورت کا مفلسی کی بنا پر، بجائے نکاح اور دوسرے جائز ذرایع معاش کے، عصمت فروشی پر آمادہ ہو جانا تو قابل فہم ہے۔ "لا" باقی مرد کا مفلسی کی بنا پر ادھر بھی متوجہ ہونا اور زیادہ بعید از فہم ہے۔ بیوی کو لاکر رکھنے میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے کیا وہ اس سے زائد ہے، جو بازاری عورتوں (وہ ادنیٰ طبقہ کی سہی) کی اجرتوں پر ان کی فرمائشوں پر، بیماریوں کے علاج معالجہ پر، یا اگر ان امراض خبیثہ سے بچنا ہے تو اس بچاؤ کے لیے قیمتی آلات اور دواؤں پر، برابر خرچ کرتے رہنا ہوتا ہے؟ کفایت کا خیال، اس طریق کے اختیار کرنے میں، سرتاسر دھوکا ہی دھوکا ہے۔

حرام کاری، اگر انسان ذرا بھی سوچ بچار سے کام لے نکاح سے کہیں زیادہ گراں پڑتی ہے، مرد کے لیے بھی اور عورت کے لیے بھی۔

اصل یہ ہے کہ اس گندگی کی طرف لانے والی، خصوصاً اسلامی حکومت و معاشرہ میں، انسان کی کوئی فطری خواہش ہوتی ہی نہیں محض طبیعت کا خبث، نفس کی شرارت ہے، جو جائز اور شریفانہ طریقوں کو چھوڑ کر ان بیہانہ راستوں کی طرف لاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح بعض طبیعتیں نفس کو ہمیشہ اس پر اکساتی رہتی ہیں، کہ بجائے جائز ذرائع معاش کے، مال و زر حاصل کیا جائے نقب زنی سے، رہزنی سے، چوری سے اور ڈکیتی سے۔ علاج تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ کے سامنے اپنی مسئولیت۔ اور ذمہ داری اور جواب دہی پر ایمان و اعتقاد، اور اس کا ہمہ وقتی استحضار۔

اکبر الٰہ آبادی شاعر سے زیادہ نباض فطرت اور حکیم ملت نے ایک قطعہ میں کیا خوب یہ سارا مضمون باندھ گئے ہیں ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بڑا، اور خوف خدا ہے اس کی دوا

آخری عرض یہ ہے کہ جس طرح فن طب ایک پورا نظام ہے، متفرق دواؤں کے رٹ لینے کا نام طب نہیں، شریعت اسلامی ایک مکمل اور عظیم الشان نظام System ہے ہر جزو دوسرے جزو سے مربوط، ہر شاخ، ہر شعبہ، دوسری شاخ، دوسرے شعبہ سے وابستہ کسی ایک جزیے کی تحقیق پوری طرح ممکن نہیں جب تک مجموعے پر نظر نہ ہو۔ آئین شریعت اپنے سارے معاشی، اخلاقی، قانونی، معاشری پہلوؤں کے ساتھ جہاں کہیں نافذ ہو جائے، وہاں مسئلہ دولت ہو یا مسئلہ زن و مرد، یا اور کوئی جزئیہ، یہ سارے مسائل از خود حل ہو کر رہیں گے۔ صورت حال ایسی ہو جائے گی، فضا ایسی قائم ہو جائے گی کہ یہ سوالات پیدا ہی نہ ہونگے۔

ملوکیت قرآن میں

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

پیچ کے دونمبروں میں "حکومت شوریٰ" کے عنوان سے تفصیل کے ساتھ دکھایا جاچکا ہے، کہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے حکومت کا نظام شوریٰ پسند کیا ہے، جس کی موجودہ بگڑی ہوئی شکل کا نام جمہوریت ہے۔ شوریت استبدادِ شخصی کے بالکل منافی ہے، اور ان تمام خامیوں اور نقصانات سے پاک ہے جو یورپ کی موجودہ نام نہاد جمہوریت نے پیدا کر رکھی ہے۔ مضمون مذکور، ہمدرد، الجمعیۃ وغیرہ متعدد اسلامی پرچوں میں نقل ہوکر شایع ہوچکا ہے۔ آج اُن دلائل و توضیحات کے دوہرانے کی حاجت نہیں۔

حال میں جامعہ ملیہ (دہلی) کے ایک استاد نے سنجیدگی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "ملوکیت اسلام کے مخالف نہیں"، اور اس دعوے پر یہ دلیل قائم کی ہے، کہ

"قرآن میں ملوک کا ذکر ہے، اور احسان کے موقع پر ذکر ہے، نیز خود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے طالوت کو ملک قرار دیا تھا"

گویا ملوکیت کی تائید میں کلام مجید سے دو دلیلیں قائم کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ قرآن میں ملوک کا ذکر موقع احسان پر آیا ہے۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے لیے حکم الٰہی سے ایک ملک مقرر کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس مضمون میں انھیں دو دلائل پر نظر کرنی ہے۔

(۱) دلیل اول سے متعلق حقیقت یہ ہے کہ سارے کلام پاک میں کل دو موقعوں پر

ملوک کا لفظ آتا ہے۔ ایک جگہ، ایک ملکہ اپنا یہ خیال ظاہر کرتی ہے، اور اللہ کے ہاں سے اس خیال کی تصدیق کی جاتی ہے، کہ

قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وكذٰلك يفعلون (نمل ع ۳)	ملوک جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر ڈالتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔[ل]

کیا اسے ملوکیت کی کوئی برکت رحمت قرار دیا جائے گا؟ کیا اس تذکرہ کو موقع احسان پر سمجھا جائے گا؟ اس کا فیصلہ ہر پڑھنے والا خود کر سکتا ہے۔

مضمون نگار کا منشا خود بھی غالباً اس آیت سے نہ ہوگا، بلکہ ایک دوسری آیت سے ہوگا، جہاں حضرت موسیٰ کی زبان سے بنی اسرائیل کو پچھلی نعمتیں ان الفاظ میں یاد دلائی گئی ہیں۔

واذ قال موسیٰ لقومه يٰقوم اذكروا نعمة الله عليكم اذ جعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكا (مائدہ ع ۴)	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم والو اللہ کی نعمت اپنے اوپر یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

اس سوال سے قطع نظر کرکے، کہ پرانی امتوں میں "ملوک" کا پیدا ہونا امت محمدیہ کے لیے کس حد تک قابل سند ہو سکتا ہے، الفاظ قرآنی صاف بتا رہے ہیں۔ کہ انبیاء اس قدیم امت میں ہوتے تھے (فیکم انبیاء) یعنی قوم اسرائیل میں سے بعض اشخاص و افراد کو یہ دولت نبوت حاصل ہوتی تھی، بخلاف اس کے بادشاہت کی نعمت افراد و اشخاص کو نہیں، قوم کو ملتی تھی۔ جعلکم ملوکا ارشاد ہوا ہے جعل فیکم ملوکا

ل۔ قال ابن عباس یقول اللہ وکذٰلك يفعلون (ابن جریر) فقال اللہ كذٰلك يفعلون يقول تعالیٰ ذكره وكما قالت صاحبة سبا تفعل الملوك اذا دخلوا قرية عنوة (ابن جریر) وكذٰلك يفعلون تصديق لها من الله عزوجل (بیضاوی) صدق الله قولها فقال وكذٰلك يفعلون اے كما قالت هي يفعلون (بغوی)

ارشاد نہیں ہوا ہے، گویا بادشاہت شخصی نہیں، قومی ہوتی تھی، اور اسی قومی بادشاہت کا نام شوریت وجمہوریت ہے۔ پس اس آیت سے اگر کسی شے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، تو وہ شخصی ملکیت وملوکیت ہرگز نہیں، بلکہ قومی حکومت وجمہوریت کی ثابت ہوتی ہے۔

"ملوک" کا ذکر کلام پاک میں انہیں دو موقعوں پر ہے، اور ان دونوں آیتوں سے بجائے ملوکیت کی تائید کے، ٹھیک اس کی تردید ومخالفت نکلتی ہے۔ پہلی دلیل کا جواب ہوگیا۔

(۲) دوسری دلیل طالوت کے ملک بنائے جانے سے پیش کی گئی ہے کلام مجید میں اس موقع پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا، قالوا وما لنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا فلما کتب علیھم القتال تولوا الا قلیلاً منھم واللہ علیم بالظالمین وقال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً (بقرہ ۳۲)	کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں پر موسیٰ کے بعد نظر نہیں کی جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک "ملک" بنا دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے کہا کہ کچھ عجب نہیں کہ اگر قتال تم پر فرض کردیا جائے تو تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے ہم کو کیا چیز اللہ کی راہ میں جنگ سے روکے گی درآنحالیکہ ہم اپنے گھروں، اور اپنے فرزندوں سے نکال دیے گئے ہیں۔ پس جب ان پر قتال فرض ہوا، تو بجز تھوڑی تعداد کے اور سب ان میں سے پھر گئے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طالوت کو ملک بنایا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ضرورتِ جنگ کا بیان ہو رہا ہے حالات ایسے ہیں جن کی بنا پر قوم بنی اسرائیل کو اپنے ظالم مخالفوں سے جنگ کرنا لازمی ہے، لیکن کوئی ان کی فوج کا سردار موجود نہیں۔ وہ اپنے وقت کے پیمبر کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ہم پر

کوئی ایسا امیر یا سردار مقرر کیجیے جو جنگ میں کامیابی کے ساتھ ہماری رہنمائی کر سکے۔ یہ عرضداشت قبول ہوتی ہے، اور طالوت کو ان کی فوج کا امیر یا سردار یا سپہ سالار بنایا جاتا ہے۔ یہاں لفظ "ملک" کا کھلا ہوا مفہوم امیر فوج یا سردار لشکر سے ہے، چنانچہ قدیم و جدید تمام ارباب شرح و تفسیر نے بالاتفاق یہی مفہوم قرار دیا ہے[1]، اور جامعہ ملیہ ہی کے ایک دوسرے استاد نے اپنی تفسیر القرآن میں تو صراحت کے ساتھ "سپہ سالار" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس قومی سرداری کو "شخصی بادشاہت" کی بحث سے کیا تعلق؟ لفظ "ملک" ہر عربی خواں جانتا ہے، کہ کتنے موقعوں پر آسکتا ہے، جو بزرگ ہر موقع پر اس کا مفہوم خواہ مخواہ ایک شخصی تاجداری سے لینا چاہتے ہیں، وہ خود اپنے علم و استعداد کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔

پھر اگر ملک کے معنی، بجائے جنگی سردار کے ملکی فرمانروا کے ہی لینے پر اصرار کیا جائے، تو اس کا بھی لحاظ رہے، کہ حسب تصریح قرآنی یہ ملک بنائے جانے کی درخواست کس کی طرف سے پیش ہو رہی ہے؟ "ملاء بنی اسرائیل" کی جانب سے اسرائیلیوں کے چوٹی کے لیڈروں کی جانب سے، قوم کے منتخب سرداروں کی جانب سے، قومی پارلیمنٹ کے ارکان کی جانب سے، جو اپنے لیے ایک زبردست شخصیت کے صدر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں شخصی تاجدار، اور مستبد فرمانروائی کی تردید کے لیے ملاء بنی اسرائیل" کی طرف سے درخواست پیش ہونا ہی بالکل کافی ہے، اور اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، کہ "ملک" کے انتخاب کا حق سرداران قوم ہی کی جماعت کو حاصل تھا، اور اس وقت وہ لوگ اپنے اس حق کو نبی کی جانب منتقل کر رہے تھے!

بفرض محال، آیت بالا میں "ملک" کے وہی معنی لے بھی لیے جائیں، جس میں وہ آج کل رئیس جمہوریت کے مقابلے میں، بطور ایک اصطلاح کے استعمال ہوتا ہے، تو بھی یہ سوال بہرحال باقی رہے گا، کہ ایک سابق امت کے اس طرز عمل سے امت محمدیہ کے لیے اس کے

---

[1] وابعث لنا ملکاً، انہض للقتال معنا امیراً نصدر فی تدبیر الحرب عن رایہ (زمخشری)
اقم لنا امیراً ننہض معہ للقتال یدبر امرہ و نصدر فیہ عن رایہ (بیضاوی)

جواز پر کیونکر استدلال واستناد کیا جائے گا درآنحالیکہ حضرت یوسفؑ کے والدین کا انہیں سجدہ کرنا۔ آج مخلوق کے لیے جوازِ سجدہ کے استناد میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔

مفسرین لکھتے ہیں، کہ یہ طالوت نہ شاہی خاندان سے تھے، نہ کسی اور معزز گھرانے سے۔ بلکہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جو اس قوم کے نزدیک ادنیٰ اور ذلیل سمجھا جاتا تھا، اور وجاہت ظاہری کے کوئی اور اسباب بھی انہیں حاصل نہ تھے، اس لیے قوم نے اپنی نادانی سے اُن پر سخت اعتراضات کیے اور ان کی سیادت وسرداری قبول کرنے سے انکار کیا۔ کلام مجید میں بھی اس اعتراض کو نقل کر کے اس کی تردید کی ہے۔

قالوا انی لہ یکون الملک علینا ونحن احق بالملک منہ ولم یوت سعۃ من المال قال ان اللہ اصطفہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔

وہ کہنے لگے کہ اُسے ہمارے اوپر کیسے حکومت مل سکتی ہے، ہم اس کی نسبت حکومت کا زیادہ حق رکھتے ہیں، اور اسے تو مال کی بھی وسعت نہیں دی گئی ہے، نبی نے کہا کہ خدا نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے، اور علم وجسم میں اسے کشادگی دی ہے۔

گویا یہ اصول قائم کر دیا ہے، کہ ذاتی فضیلت واہلیت کے مقابلے میں خاندانی فضائل، یا صاحب جائداد ہونا کوئی چیز نہیں، اور قومی سرداری میں نہ وراثت چل سکتی ہے اور نہ اس کی بنیاد جائداد پر رکھی جا سکتی ہے۔ یہ ساری تفصیلاتِ شخصی وموروثی ملکیت کی تائید وحمایت کر رہی ہیں، یا اس کے برعکس اس کی تردید ومخالفت؟

حکومت شوریٰ

قرآن مجید کسی کلام پریشان و پراگندہ کا نام نہیں، ہر سورۃ دوسری سے مربوط، اور ایک مستقل نظم کے ماتحت ہے۔ اس قانون نظم کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہر سورۃ اپنا ایک مستقل د مرکزی موضوع رکھتی ہے، اور اس صورت میں باقی جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب اسی مرکزی نقطہ کے محیط کا کام دیتا ہے۔ اس مرکزی نقطہ کو ظاہر کرنے والا عموماً وہ نام ہوتا ہے جس سے وہ سورۃ موسوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں نام اور موضوع کا یہ تعلق بالکل واضح ہوتا ہے، مثلاً سورۂ کافرون، سورۂ فتح، سورۂ جمعہ، سورۂ طلاق، سورۂ منافقون، وغیرہ، اور کہیں یہ تعلق زیادہ غور کے بعد سمجھ میں آتا ہے، لیکن ہوتا بہر حال یہی ہے، کہ ہر سورۃ کے موضوع کی کنجی خود اس کا نام ہوتا ہے، اس لئے نام کی اہمیت کو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پچیسویں پارہ میں ایک سورۃ آئی ہے، جس کا نام شوریٰ ہے۔ یہ بالاتفاق مکی ہے۔ یعنی مکہ میں اس زمانہ میں نازل ہوئی، جب مسلمان ضعف و مغلوبیت کی حالت میں تھے اور چشم ظاہر میں اُن کا مستقبل بالکل تاریک تھا۔ اُس وقت غیب سے یہ بشارت پہنچی، کہ ایک زمانہ میں اسی پست و مغلوب قوم کو بادشاہت ملیگی اور اس وقت اس کا نظام حکومت باہمی مشورہ سے ہوگا۔ اسی مشورت باہمی کی تعلیم کو اہمیت دینے اور نمایاں کرنے کے لئے خود سورۃ کا نام ہی سورۂ شوریٰ

رکھا گیا بلکہ یہ نہ سمجھا جائے، کہ حکومت شوریٰ کا تذکرہ محض ضمناً آگیا ہے، بلکہ اس پر خاص توجہ دلانی منظور رہے۔

سورۃ کے پہلے رکوع کا خلاصہ یہ ہے، کہ محمد رسول اللہ صلعم کی تحریک اوحینا الیك قرآناً عربیاً لتنذر اُم القریٰ ومن حولها انذار اُم القرے (مکہ معظمہ) اور اس کے گردوپیش (ملک حجاز) سے شروع ہوگی۔ اور یہی تحریک اک مردہ قوم میں جان ڈال دے گی، اس لئے کہ اُس پروردگار کی واللہ هوالولی وهو یحی الموتےٰ وهو علی کل شئی قدیر جانب سے ہے، جو کارساز ہے، اور مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے۔ دوسرے رکوع میں یہ ارشاد فرمایا ہے، کہ اسلام کا پیام وہی ہے، جو دنیا کے سارے انبیا لاتے رہے ہیں، اور اللہ ہی ہے، جو تمام اختلافات کا فیصلہ کر سکتا ہے، اس پیام کے پھیلانے کا حکم دے رہا ہے۔ تیسرے رکوع میں اسلام کے کامیاب و غالب ہونے کی بشارت ملتی ہے، اس لئے کہ وہ اُسی خدا کی جانب سے ہے، جو یاس و ناامیدی کے بعد بارش کو اُتارتا ہے اور اپنی رحمت کو وهوالذی ینزّل الغیث من بعد ما قنطو وینشر رحمته وهوالولی الحمید پھیلاتا ہے، اور وہی کارساز اور مستحقِ ستائش ہے۔

فتح و نصرت و کامیابی و غلبہ کی اسی صاف و قطعی بشارت کے بعد چوتھے رکوع میں اصل موضوع سورہ کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے، اور ارشاد ہوتا ہے، فما اوتیتم من شئی فمتاع الحیوۃ الدنیا وما عند اللہ خیر و ابقیٰ کہ اس دنیوی کامیابی پر نازاں و مغرور نہ ہو جانا، اور اس کو مقصود حیات نہ سمجھ بیٹھنا، یہ مادی کامیابی تو ایک عارضی و فانی شئے ہے، پائیدار و بلند تر کامیابی تو وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔

اس عام ہدایت اور ضروری نصیحت کے معاً بعد اس خوش قسمت و کامیاب قوم کے تفصیلی نظام عمل کا بیان شروع ہو جاتا ہے، اور جو قوم ہدایت عالم کے شرف سے مشرف کی گئی ہے، جس پر سب سے بڑی رحمت نازل ہوئی ہے، اُس کے انفرادی و اجتماعی، شخصی و ملی دستور العمل کی ایک ایک دفعہ کی تشریح ہو جاتی ہے۔ کہ یہ

وہ لوگ ہیں، جو دولت ایمان لِلّذین آمنوا و علی ربھم یتوکلون سے مالامال ہیں، اور جن کا بھروسہ اور اعتماد اپنے قوائے ظاہری پر نہیں، اپنے آلاتِ مادی پر نہیں اپنے فوج و خزانہ پر نہیں، اپنے اسلحہ اور اپنے قلعہ پر نہیں، بلکہ سارے اسباب کے مُسبب اول، قوتِ مطلق، اور اپنے 'رب' کے اوپر ہے! یہ اُن کے عقیدہ کی تشریح ہوئی، عمل کی توضیح یہ ہے والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش کہ دولت و امارت وجاہت، و حکومت، مل جانے کے بعد یہ ایمان والی قوم عیش و عشرت پر حریص ہو کر نہ رہے گی، شراب خواری و سود خواری میں نہ مبتلا ہوگی، زناکاری و بدمستی میں نہ پڑجائیگی بلکہ بڑے بڑے گناہوں، سخت بد اخلاقیوں، بے حیائیوں اور بے حجابیوں سے از خود بچتی رہے گی، اپنے قوائے شہویہ پر باوجود دولت و امارت قابو رکھے گی، اور پھر دوسری طرف حکومت کے نشہ، اور قوت کے زعم میں آکر بیکسیوں کی حق تلفی نہ کرے گی، واذا ما غضبوا ھم یغفرون ضعیفوں کو پامال کرنا شروع نہ کردیگی، بلکہ جب کبھی یہ لوگ کوئی ناگواری کی بات دیکھیں گے، اور غصہ ہوں گے، تو بھی عفو و درگزر کے قانون کو بھول نہ جائیں گے، بلکہ صبر و تحمل سے کام لے کر قصورواروں کی خطائیں معاف کرتے رہیں گے!

آج دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مہذب، شائستہ، متمدن، و آئین پرست قوم عمل و کردار میں نہ سہی، محض زبان و الفاظ ہی میں، اپنے ہاں کا کوئی دستور العمل عرب کے ایک اُمی (روحی فداہ) کے لائے ہوئے اور سنائے ہوئے اس دستور العمل کے مقابلہ میں پیش کرسکتی ہے؟

لیکن ابھی اس مقبول و برگزیدہ قوم کے سارے اوصافِ حسنہ ختم نہیں ہوگئے ابھی اس کے دستور العمل کی کچھ دفعات باقی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں، جو پروردگار کے حضور میں اپنی مقبولیت چاہتے ہیں والذین استجابوا لربھم جو اُس سب سے بڑی قوت کے احکام کے آگے سر جھکائے رہتے ہیں جو اُس کی فرمان برداری میں لگے رہتے ہیں، واقاموا الصلوٰۃ پھر یہ نہیں ہوتا کہ فتح

وغلبہ کے بعد مشاغلِ انتظامی یا عیش وعشرت میں پڑ کر نماز کی طرف سے غافل ہو جائیں اور اُسے ترک کرنے لگیں۔ ترک کرنا الگ رہا، اُسے پوری پابندی کے ساتھ باجماعت ادا کرتے رہتے ہیں، کہ ان کی انفرادی واجتماعی ساری فلاح اِسی نماز ہی سے وابستہ ہے، اور حکومت پا جانے کے بعد ان میں شخصیت واستبداد وملکیت کا زہر سرایت نہیں کر جاتا، ملک کو قومی امانت سمجھتے رہتے ہیں، وامرھم شوریٰ بینھم اور اس لیے انتظامات باہمی صلاح ومشورہ سے کرتے رہتے ہیں۔ نیز روپیہ کو امانت الٰہی سمجھ کر اسے اس کی راہ میں، قومی وملی مصالح کے لیے خرچ کرتے ہیں، ومما رزقنٰھم ینفقون بے کسوں اور دکھیاروں کی مدد کرتے رہتے ہیں، یہ نہیں، کہ بینکوں میں اپنے لمبے چوڑے ہی کھاتے کھول دیں، اور روپیہ جمع کرنے کی دُھن میں لگے رہیں۔

اس تصریح کے بعد، اسلامی حکومت کا کوئی اور طریقہ بجز حکومت شوریٰ کے ممکن رہ جاتا ہے؟ شوریٰ کا ذکر محض ضمناً نہیں آتا، اس کی اہمیت اور مرکزیت جتانے کو اسی کو سورہ کا عنوان قرار دیا جاتا ہے، اس کا نام بڑے گناہوں سے بچنے اور بڑی عبادتوں کے ادا کرنے کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ شوریٰ کا ذکر اُن دو عبادتوں کے عین وسط میں کیا جاتا ہے، جو اہم ترین ارکان اسلام میں سے ہیں، یعنی نماز اور زکواۃ! کیا شوریٰ کی اہمیت کا اظہار اس کے علاوہ بھی کسی طریقہ سے ممکن تھا؟ کیا جو مسائل مسلمہ طور پر داخل فرائض ہیں، اُن کے بیان میں اس سے کچھ زائد اہتمام ہے؟

لیکن حکومت شوریٰ کی تاکید یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ جنگ اُحد کے موقع پر جب سرورِ کائنات صلعم کی رائے مبارک یہ ہے، کہ مدینہ ہی میں رہ کر غنیم سے مقابلہ کیا جائے، لیکن جن سے مشورہ فرمایا گیا ان کی اکثریت اسی جانب ہوتی ہے کہ باہر نکل کر میدان احد میں معرکہ ہو، اور اس اکثریت کے مشورہ پر عمل فرما کر حضورِ انور باہر تشریف لاتے ہیں، معرکہ ہوتا ہے، اور حالت جنگ میں مسلمانوں کی ایک جماعت،

حضورؐ کے ہدایاتِ جنگ کے برخلاف عمل کرتی ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لشکرِ اسلام کو (عارضی طور پر) شکست کا سامنا ہوتا ہے، ایسے موقع پر اور ان حالات میں موجودہ مہذب دنیا کیا فیصلہ کرتی ہے؟ کم از کم یہ کہ جن لوگوں نے حالتِ جنگ میں سردار کی نافرمانی کی، وہ جنگی قانون کے مجرم ہوئے، ان کا مقدمہ کورٹ مارشل کے سامنے پیش ہو، انھیں سخت سے سخت سزائیں دی جائیں، اور جن لوگوں نے باہر نکلنے کا غلط و تباہی خیز مشورہ دیا تھا، وہ اس قابل نہیں، کہ آئندہ انھیں مجلس شوریٰ کا رکن بنایا جائے۔ لیکن احکم الحاکمین کا قانون خداوندانِ تہذیب کے قانون سے بالاتر ہے۔ اس اونچے دربار سے رسول برحقؐ کو تمام انسانی قیاسات و توقعات کے خلاف یہ حکم پہنچتا ہے، کہ اے رسولؐ انھیں سزا دینا، ان سے انتقام لینا الگ فاعف عنھم رہا، تو درگزر سے کام لے، اور انھیں معاف ہی کر دے صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ان کے حق میں دعائے مغفرت بھی کر واستغفرلھم کہ یہ سزائے آسمانی سے اور آئندہ خطاؤں سے محفوظ رہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جنگ میں نقصان اگرچہ انھیں کی غلط رائے سے ہوا، لیکن شوریٰ کا اصول اس قدر بلند و مستحکم ہے کہ ان کی غلطی سے، اکثریت کے غلط مشورہ سے اس اصول پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، تو ان کو (Disenfranchise) نہ کر، ان سے ان کا حق شوریٰ وشاورھم فی الامر سلب کر، انھیں بدستور مجلس شوریٰ میں شریک رکھ، اور ان سے معاملات میں مشورہ کرتا رہ![1]

یہ حکم رسول اکرمؐ کو ملتا ہے، جو وحی الٰہی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر خام عقل انسانی کے مشوروں سے قطعاً بے نیاز تھے، لیکن اصول شوریٰ کی تقدیس و احترام کی خاطر رسول اقدسؐ تک کو امتیوں اور خطاکار امتیوں سے مشورہ کرتے رہنے کا حکم

---

[1] شاہ عبد القادرؒ اس آیت پر اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں فرماتے ہیں "شاید حضرتؐ کا دل مسلمانوں سے خفا ہوا ہوگا، اور چاہا ہوگا کہ اب سے ان کی مشاورت نہ پوچھیے۔ سو حق تعالیٰ نے سفارش کی اور فرمایا کہ اول مشورت لینی بہتر ہے۔ جب ایک بات ٹھہرا چکے، پھر پس و پیش نہ کرے"!

ملتا ہے[1]۔ پھر امت اسلامیہ کے کسی فرد کے لئے جسے وحی کی تائید غیبی بھی نہیں حاصل شوریٰ سے بے نیازی۔ غیر مشوری حکومت، کسی وقت، کسی جگہ، اور کسی حال میں بھی جائز ہو سکتی ہے ؟

یہ اللہ کے احکام تھے۔ رسولؐ کا عمل کیا اس سے کچھ الگ تھا ؟ یوم اُحد، یوم بدر، یوم خندق، یوم حدیبیہ، واقعۂ افک، خانگی و اجتماعی، ذاتی و ملی زندگی کا کوئی بھی ایسا اہم موقع چشم کائنات نے دیکھا ہے، جب سرورِ کائناتؐ نے عاجزہ و درماندہ اُمیتوں کو شریک مشورہ نہ فرمایا[2]! حافظ ابن کثیر ان واقعات کو ایک ایک کر کے گناتے ہیں۔

پھر کیا ام المومنین حضرت صدیقہؓ کے اس قول میں شبہ کیا جائے گا کہ

عن عائشۃ انہا قالت ما رائیت رجلاً اکثر استشارۃ للرجال عن رسول اللہ صلعم (معالم بغویؒ) میں نے رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کسی کو لوگوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

یا اصحاب رسولؐ کے اس متفقہ اُسوۂ عمل سے کسی دلیل کی بنا پر روگردانی کی جائے گی، کہ

عن ابی ہریرۃ ما رائیت احداً اکثر مشاورۃ من اصحاب الرسول صلعم (کشاف، زمخشری) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ اصحاب رسول سے بڑھ کر میں نے کسی کو مشورہ کرتے والا نہیں دیکھا!

لفظ "جمہوریت" شریعت اسلامی کی اصطلاح نہیں، بلکہ سیاسیاتِ مغرب کی اصطلاح ہے۔ یہ لفظ سنتے ہی دماغ ان خرابیوں اور ابتریوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جن سے مغرب کی موجودہ جمہوری حکومتیں لبریز ہیں۔ قرآن کریم نے جس شے کا فرمان امت اسلامیہ کو دیا ہے، وہ جمہوریت نہیں، مشورت ہے، اور اسلام کا نظام شوریٰ

---

[1] قال الحسن قد علم اللہ ان مابہ الی مشاورتہم حاجتہ ولکن اراد ان یستن بہ من بعدہ من امتہ (فتح البیان جلد ۲)۔

[2] کان رسول اللہ صلعم کثیر المشاورۃ لہم (جلالین)۔

موجودہ جمہوریتوں کے نقائص وعیوب سے یکسر پاک ہے۔

جو امور عین فطرتِ بشری کے موافق ہیں ان کے برتنے کے لئے کسی طویل وعریض، مصنوعی نظام وضابطہ قایم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، قرآن حکیم (جو حشو و زوائد سے یکسر خالی ہے) ایسے موقع پر صرف اجمالی رہنمائی کر کے چھوڑ دیتا ہے، تفصیل ہر شخص کی عقل سلیم خود کر لیتی ہے، والدین کی تعظیم کا اجمالی حکم قرآن نے دے دیا، اس کے سارے تفصیلی طریقے نہیں بیان فرمائے، زن وشوہر کو ایک دوسرے کی رفاقت و محبت کی ہدایت فرمادی، اس کے جزئیات فطرتِ سلیم پر چھوڑ دئیے۔ خاندان کی معاشرت کی طرح خاندان امت کی معاشرت بھی ہے۔ جس طرح افسر خاندان اپنی خانگی انتظامات میں ہر فرد خاندان کے مزاج، طبیعت، ومصلحت کا لحاظ رکھ لیتا ہے ٹھیک اسی طرح خاندانِ امت کے افسر، جماعتِ ملت کے امیر، کو بھی صرف اسی قدر ارشاد فرمادیا گیا، کہ معاملات وانتظامات میں مشورت باہمی سے کام لیتا رہے اس سے زیادہ تفصیلات بیان کرنا، بالکل ایسا ہی تھا، کہ تعظیم وآدابِ والدین، اور محبت ورفاقتِ زوجین کے ایک ایک جزئیہ کو ضابطہ کے تحت میں لایا جائے۔

لفظ "شوریٰ" کے معنی ہیں، وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے الامر الذی یتشاور فیہ اور مشورہ ومشاورہ کے معنی ہیں۔

والمشورۃ استخراج الرأی بمراجعۃ البعض الی البعض (راغب)

ایک دوسرے کی طرف رائے کو پھیر کر رائے کو نکالنا یا حاصل کرنا۔

لفظ اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل مطلق ہے "ایک دوسرے کی طرف" میں کسی طرح کی قید یا شرط نہیں۔ پھر کلام پاک میں جہاں لفظ شوریٰ آیا ہے، وہاں بھی سیاق عبارت کسی قسم کی قید یا شرط کا متقاضی نہیں۔ گویا، رائے جن کے درمیان گشت کرتی رہے، جن لوگوں کی رائے حاصل کی جاتی رہے، وہ کوئی ایک محدود جماعت نہیں بلکہ اس کا حق ساری امت اسلامیہ، سارے گروہ مسلمین کو ہے۔ اس وسعت حقوق کی نظیر تیرہ سو برس اُدھر نہیں، تیرہ سو برس اِدھر بھی، تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی، آج دنیا کے کسی گوشہ میں مل سکتی ہے؟

آج مہذب و شائستہ، حریت دوست و جمہوریت نواز دنیا کا کیا حال ہے!
انگلستان، فرانس، امریکہ، ان سب ملکوں میں ووٹ (رائے) کا حق کس کو حاصل ہے؟ اُن کو جو یا تو فلاں درجہ تک تعلیم رکھتے ہیں، یا فلاں مقدار میں ٹیکس ادا کرتے ہیں یا فلاں مدت تک اس مقام میں قیام کر چکے ہیں، یا شہریت کے اور فلاں فلاں حقوق رکھتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ عام خلقت کسی ایک معاملہ میں بھی براہ راست رائے نہیں دے سکتی، بلکہ محض اپنے "نمایندے" منتخب کرسکتی ہے، اور ان نمایندوں کی مختصر و محدود جماعت ہی، امور سلطنت کے، معاملات ملک کے بحث و مباحثہ میں براہ راست حصہ لے سکتی ہے، باقی ملک کی وسیع و کثیر آبادی کو محض اُنھیں کی اصابت رائے و دیانت پر قانع ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ پھر انسانی آبادی کا ایک بڑا طبقہ، محض جرم جنسیت میں، یعنے بجائے مرد کے عورت ہونے کے جرم میں، بعض آزاد و جمہوری حکومتوں میں آج تک ووٹ کے حق سے محروم ہے، اور بعض میں ابھی کل کی بات ہے، کہ اسے اس کی اجازت ملی ہے۔

پھر ہر الکشن (انتخاب) کے موقع پر ان شائستہ ملکوں میں ناشائستگی کا جو طوفان برپا ہوتا رہتا ہے، اُس کی ایک ادنیٰ جھلک اب ہندوستان میں بھی نظر آنے لگی ہے اور اس کا پورا نمونہ مغرب ہی کی مہذب دنیا میں نظر آتا رہتا ہے۔ امیدواروں کے درمیان رشک و حسد، ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی اور بہتان طرازی، خود نمائی و خودستائی، رائے دہندوں پر ناجائز دباؤ ڈالنا، طرح طرح کی رشوتیں دے دے کر اُن کے ضمیر کو خریدنا، اُنھیں طرح طرح کے فریب دینا، ان کے سامنے ایسے وعدے کرنا جن کے پورا کرنے کی ذرا بھی نیت نہیں، کاغذات انتخاب میں جعل بنوانا، انتخابی جلسوں میں بدزبانی سے بڑھ کر فوجداری کی نوبت آجانا، قوم کا مختلف پارٹیوں اور جتھوں میں تقسیم ہوجانا، یہ ساری برکتیں اسی موجودہ "جمہوریت" کی ہیں۔
خدائے اسلام کی فرمائی ہوئی "شوریت" رسول اسلام کی قایم کی ہوئی "شوریت" "جمہوریت" کی ان ساری لغویتوں سے یکسر پاک اور بے داغ ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں، ووٹر بننے کے لئے نہ کسی خاص محکمہ میں اپنے کو پیش کرنے کی ضرورت، نہ ووٹ دینے کے لئے کسی تعلیم کی، کسی تعداد آمدنی کی، کسی خاص اہلیت کی حاجت، نہ مرد و عورت کی کوئی تفریق، نہ نمائندوں کے انتخاب کا کوئی جھگڑا نہ انتخابات کی مہم پر لاکھوں کا خرچ، نہ کونسل ہال کی تعمیر کے لئے اینٹ اور چونے پر لگانے کے لیے دولتِ قارون کی احتیاج، نہ عمر کی قید نہ رنگ کی، نہ وطن کا امتیاز نہ نسل و قوم کا، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے قطعاً بے نیازی۔ شرط اور صرف ایک ہی شرط کلمہ گو ہونے کی! جس انسانی ہستی نے جہاں اور جس وقت بھی کلمۂ شہادت کی تصدیق کی معاً وہیں، وہ مجلس شوریٰ کا ممبر بغیر کسی ضابطہ پُری کے، بغیر کسی فیس کے، بغیر کسی دردِ سر کے، ہوگیا، اور اسی وقت سے اسے امیر و خلیفہ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی آزادانہ رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہوگیا، نہ اُسے اس کی حاجت، کہ کوئی اس کا انتخاب کرے، نہ اسے اس کا انتظار، کہ پارلیمنٹ یا کونسل کے اجلاس کا وقت آئے، نہ اُس کے لیے یہ مرحلہ کہ وہ حکومت کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھائے۔ اُس کا مسلم ہونا، مترادف ہے، اُس کے رکنِ مجلس شوریٰ ہونے کے!

فرانس کی حریت نوازی کا غلغلہ آج ساری دنیا میں بلند ہے، دنیائے تہذیب میں فرانس اور آزادی کے ایک ہی معنی سمجھے جاتے ہیں، لیکن خود دختران فرانس آج تک ووٹ کے لئے چلا رہی ہیں، اور ایوان حکومت سے یہ کہہ کہہ کر اپنا سر ٹکرا رہی ہیں، کہ آخر ہم بیچاریوں کو محض عورت ہونے کے جرم میں کیوں ممبری سے محروم کر دیا گیا ہے ﴿بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ یہ نمونہ ہے مغرب کی جمہوریت کا! اس کے مقابلہ میں خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کو ان کے اجلالِ فاروقی سے مرعوب و متاثر نہ ہوکر، جو آواز سر منبر ٹوکتی ہے، اور بغیر "امیر المومنین" "خلیفہ رسول اللہ" "یور مجسٹی" "یور ایکسلنسی" "یور لارڈشپ" وغیرہ کے مصنوعی القابِ تعظیم) استعمال کئے ہوئے، بغیر پورا نام مبارک بھی لئے ہوئے، بلکہ محض "ابن خطاب" (اے خطاب کے لڑکے) کہہ کر پکارتی ہے، وہ ایک معمولی بوڑھی عورت کے گلے سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے! اور وہ آواز ایسی

موثر ثابت ہوتی ہے، کہ رسول خدا کا یہ جلیل القدر رفیق صحبت، عراق و شام کا فاتح، قیصر وکسریٰ کے سرپرغرور کو کچلنے والا معاً اعتراض کو تسلیم کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے! یہ نمونہ تھا، اسلام کی شوریت کا!

اسلامی مجلس شوریٰ کے لیے کسی عالیشان عمارت کی ضرورت نہیں۔ ہر مسجد کا صحن اور دالان دار الشوریٰ ہے۔ نمائندوں اور انتخاب کی ضرورت نہیں، ہر کلمہ گو ووٹر ہے، اجلاس شوریٰ کے لیے ہفتوں اور مہینوں کے انتظار کی حاجت نہیں، بلا ناغہ ہر روز پانچ مرتبہ اُس کے اجلاس ہو سکتے ہیں، اور ضرورت ہو تو امیر مجلس وقت کا ہر لمحہ اس کے لیے وقف ہو سکتا ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنا ووٹ دے بھی، بڑی آبادیوں میں ایسا ہونا شائد ممکن بھی نہیں، لیکن یہاں سوال عملاً ووٹ دینے کا نہیں بلکہ ووٹ کے حق کا ہے، اور یہ حق، ہر کلمہ گو کو اُسی لمحہ سے حاصل ہو جاتا ہے، جب سے وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔

حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کی تقریریں اور خطبات جن میں بار بار اس قسم کے اعلانات ملتے ہیں، کہ

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذ اعصیت اللہ ورسولہ فلاطاعۃ لی علیکم۔ جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرو، اور جب میں ان کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت نہ کرو یا یہ کہ

اما انا ومالکم کولی الیتیم۔ مجھے تمھارے مال میں (یعنی سرکاری خزانہ میں) بس اسی قدر حق حاصل ہے، جتنا یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں ہوتا ہے۔ سو ان تمام موقعوں پر خطاب، اپنے ہمسر و ہم چشم چند رفیقوں کی جانب نہیں ہوتا تھا، بلکہ عامہ مسلمین کی ساری اسلامی آبادی کی جانب ہوتا تھا، اور بعض خطبات میں تو اس سے بھی ترقی کر کے "ایھا الناس" کا لفظ موجود ہے۔ یہ اگر اسلامی شوریت کا احساس نہیں تھا، تو پھر آخر کیا تھا؟

احساس شوریت جب تک زندہ رہا، ہر قدم مشورت کے سایہ میں اٹھتا رہا

اور علما، تصریح کرتے رہے، کہ

قال ابن خواز منداد واجب علی الولاۃ مشاورۃ العلماء فی ما لایعلمون وفی ما اشکل علیھم من امور الدنیا ومشاورۃ وجوہ الجیش فی ما یتعلق بالحرب وجوہ الناس فیما یتعلق بالمصالح ووجوہ الکتاب والعمال والوزراء فیما یتعلق بمصالح البلاد وعمارتھا (فتح البیان جلد ۲)

حاکموں پر، عالموں سے اُس چیز میں مشورہ کرنا جو اُن کے علم میں نہ ہو، یا جو امر انھیں مشکل معلوم ہو، اور سرداران فوج سے امور جنگ میں مشورہ کرنا، اور سرداران قوم سے مصالح ملکی میں مشورہ کرنا، اور افسروں، عہدہ داروں، اور وزیروں سے شہروں کے معاملات میں مشورہ کرتے رہنا واجب ہے۔

اسی قدر نہیں، بلکہ یہ اعلان حق ہوتا رہا، کہ

حکی قرطبی عن ابن عطیۃ انہ لاخلاف فی وجوب عزل من لایستشیر اھل العلم والدین (فتح البیان جلد ۲)

جیسا قرطبی نے ابن عطیہ سے روایت کی ہے، جو امیر اہل علم و دین سے مشورہ نہ کرتا رہے اُس کی معزولی کے واجب ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

گویا، دوسرے الفاظ میں، وہ شخص بذات خود کتنا ہی صاحب علم، صاحب عقل، صاحب تقویٰ ہو، اگر قانون شوریت کا پابند نہیں، تو اُسے مرتبۂ حکومت سے معزول کر دینا، جائز ہی نہیں، واجب ہے۔

دنیا کی وہ سب سے بڑی ہستی، جس کی نظیر خالق السموات والارض نے نہ آج تک پیدا کی، اور نہ آئندہ پیدا ہونے کو ممکن بتایا ہے، یہی نہیں کہ شوریت کی سب سے بڑی مبلغ رہی ہے۔

اما ان اللہ ورسولہ یغنیان عنھا ولکن اللہ جعلھا رحمۃ لامتی فمن استشار من امتی لم یعدم رشداً ومن ترکھا لم یعدم غیا (فتح البیان جلد ۲)

اللہ اور اس کا رسول، مشورہ سے بے نیاز ہیں لیکن اللہ اسے بطور رحمت میری امت کے لیے کر دیا ہے، میری امت والے جب تک مشورہ پر قایم رہیں گے راہ راست پر رہیں گے اور جب مشورہ چھوڑ دیں گے، بھٹک کر رہیں گے۔

ما شاور قوم قط الا ھدوا لارشد امورھم (ابن جریر جلد ۴)

ہر قوم جب تک مشورت پر قایم رہی، ہدایت کے بہترین راستہ پر قایم رہی بلکہ وہ ذات اقدس، باوجود ہر انسانی رائے و مشورہ سے بے نیاز ہونے کے خود ہی سب سے زیادہ کثیر المشاورۃ، سب سے زیادہ قانون شوریت پر عمل کرنے والی گذری ہے۔

عن عایشۃ انھا قالت ما رائت رجلا اکثر استشارۃ للرجال من رسول اللہ صلعم (معالم التنزیل بغوی تفسیر آیہ شاورہم فی الامر)

حضرت عایشہؓ فرماتی ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کسی کو لوگوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

تہذیب لندن کی کہانی

ایک لندنی کی زبانی

لندن، تہذیب و تمدن کا مرکز، تعلیم و شائستگی کا گہوارہ، اور علوم وفنون کا مخزن ہے، عقل سلیم کہتی ہے کہ اگر وہاں بھی اندھیرا ہوا، تو روشنی کی تلاش کہاں کی جائے گی؟ لیکن یہ سن کر، اور وہ بھی ایک انگریز کی زبان سے آپ کو حیرت ہوگی، کہ خود برطانوی پولیس کے پاس جو نقشہ ہے اُس میں مخدرات (نشیلی دواؤں مثلاً افیون، کوکین، وغیرہ) کی خفیہ فروشی کے جو خاص مرکز دیے ہوئے ہیں اُن میں

"لیورپول، سوتھمپٹن اور گلاسگو کے ساتھ لندن بھی ہے" (ص۱۵)

یہ بیان کسی دشمن برطانیہ کا نہیں، خود لندن ہی کے ایک معزز اہل قلم مسٹر شیلر کرافٹ کا ہے، جن کی کتاب (Cloven Hoof) کے نام سے ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب ناول یا افسانہ نہیں اور نہ برطانیہ کو بدنام کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ ایک سنجیدہ تبصرہ شہر لندن کی اخلاقی پستیوں پر ہے، اور مصنف کا مقصود خیر خواہی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کو اُن خطرات سے آگاہ کردینا ہے ضخامت ۱۷۶ صفحہ۔ قیمت ½۷ شلنگ، اور ناشر (Denisarcher) ۶۔ اولڈ گلوسسٹر اسٹریٹ۔ لندن۔ ہم آپ بھی لندن کی سرسری سیر اسی قابل اعتماد روشنی میں کرسکتے ہیں۔

"صاحب لوگوں" کی شراب خواری سے سب واقف ہیں، لیکن یہ دوسرے قسم کے نشے تو مشرق ہی کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ بیان بالا سن کر قدرۃً حیرت ہوتی ہے، اور اس حیرت میں ترقی یہ سُن کر ہوتی ہے، کہ یہ مرض ملک میں اندر ہی اندر پھیلا ہوا ہے، پولیس کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے پاتی، چنانچہ سنہ ۳۰ء میں اس جرم کی علت میں گرفتاریاں کل ۶۵ ہوئیں، اور مصنف کو لکھنا پڑا، کہ

"جرم اور انکشاف جرم کے درمیان عدم مناسبت حیرت انگیز ہے" ص ۲۷

عام کسبیوں اور بیسواؤں کا پیشہ ہماری آپ کی نظر میں جیسا ذلیل ہے ظاہر ہے۔ لندن شہر میں عام بے عصمتی سے قطع نظر کر کے ان مخصوص پیشہ وروں کی تعداد ۳۰ ہزار ہے (ص ۲۹) یہ وہ ہیں، جو باضابطہ لائیسنس لئے ہوئے علانیہ اور خالصتاً اسی پیشے کو کر رہی ہیں، اور ہندوستان کی بیسواؤں کی طرح گانے، بجانے، ناچنے وغیرہ کی آڑ نہیں رکھتیں! اور تعداد تو خیر یہ ہے ہی "کمیت" سے بڑھ کر "کیفیت" درد انگیز ہے، یونان قدیم میں اس طبقہ کی عورتیں نفاست و شائستگی کی تصویر سمجھی جاتی تھیں، اور خود لکھنؤ میں بھی شاہی زمانہ میں اونچی طوائفیں داس قابل تھیں، کہ اچھے اچھے امیرزادے شائستگی، تمیزداری، اور خوش سلیقگی کی تربیت حاصل کرنے کو ان کی خدمت میں بھیجے جایا کرتے تھے۔ لندنی بیسوا بیچاری ان اوصاف سے بھی تہی دامن ہے۔ اس کے محبوب مشاغل، علاوہ اپنی عصمت فروشی کے یہ ہیں۔

"نشیلی دواؤں کا استعمال، شرفار کو دھمکا کر ان سے روپیہ وصول کرنا، مخبری کرنا، ناجائز شراب کی تجارت پر کمیشن وصول کرنا، اور جیب کاٹ لینا! بیسوا ہونا اور جرائم پیشہ ہونا کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہو گیا ہے، کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے" ص ۲۹

اور اس اجمال کی تفصیل مصنف اپنے معتبر معلومات، اکثر ذاتی علم سے، دس بارہ صفحوں میں کرتا ہے

جوئے کی جو جو "لطیف" "نادر اور مخفی" شکلیں، انگریزی عہد حکومت کے ساتھ ہی

ہندوستان میں رائج ہو گئی ہیں "گھوڑ دوڑ کا جُوا"، "اور لاٹری" اور "کارنیوال"، "اور بیمہ کمپنی"، اور خدا معلوم اور کیا کیا اس کے لحاظ سے، اعتراف ذیل، توعین توقع کے مطابق ہے:۔

"انگریزوں کا من حیث القوم جواری ہونا تو ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میرے خیال میں، اگر قمار بازی کو معصیت قرار دیا جائے، تو ہر انگریز اس میں اپنی توہین سمجھے اور اُسے غصہ آجائے" (صفحہ ۴۲)

تاہم ان حدود کا جو اقتباس ذیل سے ظاہر ہوتے ہیں، گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر کے بھید، تو گھر کے بھیدی ہی کی زبان سے کھل سکتے ہیں۔

"تمام قوموں میں ہم ہی ایسے ہیں، جن کے ہاں بجز اتوار کے دن اور گڈ فرائیڈے اور بڑے دن کے گھوڑ دوڑ سال بھر برابر ہر روز ہوتی رہتی ہے اور اس موقع پر جو بازیاں لگتی ہیں، چاہے وہ کتنی ہی قیود و شرائط کے ساتھ ہوں سب کہیں سے زیادہ کھل کر لگتی ہیں۔ یہ مشغلہ ہماری قوم کے ہر طبقہ کا جزو زندگی بن گیا ہے، انگریز چاہے کیسا ہی کسی کام میں لگا ہوا ہو، کیسا ہی اُس کا دل پھنسا ہوا ہو، کیسا ہی غریب و مفلس ہو، لیکن بازی لگانے سے کبھی نہ باز آئے گا، اس کے لئے پیسہ اور وقت ضرور نکال لے گا۔ قانون نے جو کچھ تھوڑی سے روک تھام کر دی ہے، وہ گویا سمندِ شوق پر تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ تھوڑی بہت ضد اور ہٹ اور قانون شکنی کی ہمت ہم سب میں رہتی ہے۔ اور پھر اگر یہ خفیف روک تھام ہٹالی جائے، تو ہمارے ہزارہا ہزار ہم قوم بے معاش اور بے روزگار ہو جائیں، خاص شہر لندن میں کوئی ایک لاکھ افراد تو ضرور ایسے نکلیں گے، علاوہ باضابطہ دلالوں اور اُن کے عملہ والوں کے، جن کا ذریعہ معاش یہی ہے" (صفحہ ۴۳، ۴۴)

نشہ بازی، پیشۂ حرام کاری، اور قمار بازی کے ان مناظر کے بعد، ان سے بھی افسوس ناک تر ابواب پیش نظر ہوتے ہیں، اور وہ شہوت پرستی کے دوسرے اصناف سے متعلق ہیں۔ لندن کی سی گھنی اور وسیع آبادی کے اندر ان امراض کا نفس وجود باعث حیرت نہیں۔

بدمعاش اور اوباش کہاں اور کس سوسائٹی میں نہیں ہوتے؟ لیکن مصنف کے بیان سے تو یہ انکشاف ہوتا ہے، کہ اس بدمعاشی میں بھی ایک خاص نظم و انتظام موجود ہے مردوں کی طرف میل رکھنے والے مردوں کے باضابطہ کلب ہیں، سوسائٹیاں ہیں، اور ان کے ارکان اور ان کے سرپرست، بازار کے شہدے اور لفنگے نہیں، بلکہ

"اسکولوں کے ماسٹر، گرجوں کے پادری، اور اسکاوٹ ماسٹر حضرات ہیں۔ یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اقتدار سے فائدہ اٹھا کر کمسن لڑکوں کو پھانستے رہتے ہیں" صنہ

یہ حال مردانہ سوسائٹی کا ہوا۔ صنف نسواں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ جو عورتیں عورتوں کی طرف میل رکھتی ہیں، وہ بدبختی سے، سب سے زیادہ تختۂ مشق اپنی قریب ترین عزیز عورتوں ہی کو بناتی رہتی ہیں، اور ایسیوں کی تعداد خطرناک حد تک زائد ہے ! صنہ غیر طبعی شہوت رانی کے یہ دو طریقے بہرحال متعارف و معروف ہیں لیکن شیطنت کچھ انھیں دو طریقوں پر بند نہیں۔ یہ بھوت جب انسان پر سوار ہوتا ہے تو خدا معلوم ذہن کہاں کہاں پہونچ جاتا ہے۔ چنانچہ لندن والوں نے اسی معتبر لندن والے کے حسب بیان عجب عجب صورتیں ایجاد کر رکھی ہیں، جن میں سے بعض نہایت ہی درجہ نفرت انگیز ہیں، اور ناقابل ذکر تو سب کی سب۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ حقیقت بھی آشکار ہو کر رہی ہے، کہ

"یہ تو عرصہ سے معلوم و معروف تھا، کہ لندن میں خاص انھیں اغراض کے پورا کرنے کے لئے مستقل عمارتیں موجود ہیں، لیکن حال میں ایک مقدمہ کے دوران میں اس کا علم ساری پبلک کو بھی ہو گیا ہے" صنہ ۹۶

خواہش نفسانی کے پورا کرنے کے لئے، بجائے انسان کے جانور کا استعمال ایک ایسی حیوانیت ہے، جس کے تصور ہی سے مذاق سلیم کو استفراغ ہونے لگتا ہے، لیکن تہذیب و تمدن کے عجائب زار میں ایسے ایسے درندے اور بہائم بھی انسان کی صورت میں موجود ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ خاص گندگی۔

"فاعلی حیثیت سے مردوں میں تو شاذ ونادر ہی ہے، لیکن متعدد ڈاکٹروں نے، جن میں سے دو کی پریکٹس اعلیٰ امیر گھرانوں میں ہے مجھ سے زور دے کر بیان کیا کہ اس کا وجود صنف نسواں کے اعلیٰ طبقہ میں ہے، جو ایک خاص قسم کے کتے اس غرض سے پالے رہتی ہیں" (صفحہ ۱۰۱) جن ڈاکٹر دوستوں نے مجھ سے یہ بیان کیا، انھوں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ کتے باوجود ایک مخصوص قسم کے ..... رکھنے کے اس طرح سدھائے جا سکتے ہیں، کہ عورت کی خواہش نفسانی کو پورا کر سکیں۔ اور ہائیڈ پارک کے قریب تو ایک کتا خانہ خاص اسی غرض سے ایک عورت نے کھول رکھا تھا، جس میں وہ کتوں کو اسی کے لئے سدھاتی تھی۔ پولیس کو معلوم نہیں اس کا پتہ چلا یا نہیں، لیکن اب وہ کارخانہ ٹوٹ چکا ہے" (صفحہ ۱۰۲)

انسانیت کی توہین وتذلیل کی کوئی صورت اس سے بڑھ کر خیال میں بھی نہیں آسکتی!

فحش کاری کی ان انتہائی پستیوں کے بعد، فحش نگاری اور فحش تصویروں، فحش تماشوں کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ جنھیں عملاً ان گندگیوں سے احتراز نہیں، اُنھیں ان کی نقل وعکاسی سے کیا احتیاط ہو سکتی ہے؟ نتیجہ قدرتاً یہ ہے کہ فحش کتابوں، فحش پوسٹ کارڈوں، فحش تصویروں کا دَور دَورہ ہے کتابیں جو اس صنف کی شائع ہوتی ہیں، اُنھیں یا تو کسی کی خود نوشت سوانح عمری سے موسوم کر دیا جاتا ہے، یا پھر اُن کا نام نیم طبی یا نیم سائنٹیفک رکھ دیا جاتا ہے۔ بات دونوں صورتوں میں وہی، اور مغز دونوں قالبوں کے اندر ایک ہی ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۴۰) "یہ طبی" اور "سائنٹیفک" کتابیں عموماً ان دوا فروشوں کے ہاں بکتی رہتی ہیں، جو "ضبط تولید" کی دواؤں اور آلات کا کاروبار کرتے رہتے ہیں، اور ڈاک کے ذریعہ سے بھی طبی مشوروں کی آڑ میں، دھڑتے سے روانہ ہوتی رہتی ہیں۔ (صفحہ ۱۴۱)

یہ واضح رہے، کہ کوئی اکہری تصویر، خواہ کیسی ہی بے پردہ و برہنہ ہو، انگلستان کے قانون میں ممنوع نہیں۔ جرم اور قانوناً فحش صرف وہ تصویریں قرار پائیں گی، جو دوہری ہوں، یعنی جن میں دو شخصوں کے درمیان کوئی بے حیائی کا عمل دکھایا گیا ہو
مصنف کا بیان ہے، کہ

> "فحش تصویروں والے پوسٹ کارڈوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے، کارڈ اس آسانی سے، اور بعض اوقات اسی آزادی سے اِدھر سے اُدھر پھیل رہے ہیں، جیسے اخبارات ..... افسوس ہے کہ پچھلے سال دو سال میں یہ وبا اور زیادہ پھیل گئی، خصوصاً لندن میں ..... اور دوسرے سودوں میں وہ نفع نہیں جو اس میں ہے" (ص ۱۴۳)
>
> "اور ایسے ایسے لوگ اس آبادی میں موجود ہیں جو اپنی یہ تصویریں کھنچواتے ہیں، انھیں کھینچتے ہیں، انھیں چھاپتے ہیں، اور پھر اُن کی فروخت و اشاعت کرتے ہیں" (ص ۱۴۴)

گندگی و غلاظت کا جو مرقع ابھی آپ کی نظر سے گزرا، خوش نہ ہو جئے کہ آپ کے دشمن ان حرکتوں میں مبتلا ہیں۔ دشمن ہوں یا دوست، بہرحال انسان ہی ہیں انسانیت کی ان پستیوں پر ماتم کیجئے۔ اور ہو سکے تو ان غلط رو اور گمراہ بھائیوں اور بہنوں سے ہمدردی، موقع مسرت کا نہیں، رنج کا، اور وقت ہنسنے کا نہیں، رونے کا ہے۔ لیکن یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے، کہ اتنا تنزل و تسفل بہ صورت ثبات عقل و ہوش ممکن کیوں کر ہے؟ یہ حالت تو طبعی نہیں، بالکل غیر طبعی ہے، صحت کی نہیں مرض کی ہے، مگر یہ غیر طبعی حالت، یہ حالت مرض، کیوں کر وجود میں آئی؟

کل اسباب پر بحث، اور سب کا استقصار، یہاں نہ مقصود ہے، اور نہ اتنی گنجائش میں ممکن۔ لیکن ایک بڑا سبب تو اس زوالِ عقل و زوالِ حیا کا شراب خانہ خراب ہے۔ مشرق نے اسی لئے اسے "ام الخبائث" کہہ کر پکارا۔ یہ ایک خرابی، خدا جانے

کتنی خرابیوں کی جڑ، یہ ایک بیماری خدا معلوم کتنی بیماریوں کا گھر ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے رند مشرب کا بیان ہے، کہ "ہم لوگ تخلیہ میں جو چاہیں کر لیں، لیکن اعلان کے ساتھ، سر بازار، سر بزم، ہم میں جو بڑے سے بڑے بے حیا ہیں، ان سے بھی بے حیائی، ممکن نہیں، برہنہ تصویر کھنچوانے وغیرہ کی کیفیت صرف شراب نوشی کا نتیجہ ہے، جس میں عقل بالکل زائل ہو چکی ہے" اور عجب نہیں کہ یہی تشخیص صحیح ہو۔

مصنف نے کتاب کا ہر باب بہت بچ بچ کر لکھا ہے، اپنے ہم وطنوں کی طرف زیادہ سے زیادہ تاویلیں کی ہیں، لیکن مے خواری کے عنوان کے ماتحت وہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف واقبال پر تل گیا ہے۔ کہتا ہے:۔

"مے نوشی کی معصیت اتنی قدیم ہے، اور شعر و ادب نے اسے اتنا رنگین بنا دیا ہے، کہ انگریزی قوم میں یہ عیب کوئی عیب نہیں رہا ہے، بلکہ لوگ اسے ہنر سمجھنے لگے ہیں، اور ایسا جوہر کہ بغیر اس کی گویا مرد کی مردانگی میں فرق ہے۔ ترکِ مے نوشی کا وعظ مضحکہ خیز ہو گیا ہے، اور "اعتدال" کا نام لیتے ہی سالویشن آرمی کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے" (ص۱۴۲)، "شراب تقریباً ہم سب کے سب پیتے ہیں، اور ایک معنی کر کے بہت ہی زائد پیتے ہیں" ایضاً

جب عیب ہنر بن جائے اور بجائے شرمانے کے اُس پر فخر کیا جانے لگے، تو علاج کی کیا صورت، اور شفا کی کیا اُمید؟

"اس بیان پر چاہے ہنس لیا جائے۔ چاہے غصہ کیا جائے، چاہے اس کی تردید یا تضحیک کی جائے۔ لیکن حقیقت واقعہ ہے یہی، کہ ہم شراب بہت ہی زائد پینے کے عادی ہیں۔ ہم خود بھی اسے محسوس کرتے ہیں، اور باہر والے بھی۔ ہماری قوم افیون، کوکین، وغیرہ کی چنداں شائق نہیں، اور دوسری یورپی قوموں کے مقابلہ میں کچھ ایسی بدچلن اور مسخ شدہ بھی نہیں، نہ ہم من حیث القوم جرایم خلاف وضع فطرت

کے دل دادہ ہیں، اور نہ ہمارے ہاں بیسوائیں بعض اُن ملکوں سے زائد ہیں جن کی آبادی ہماری نصف ہے، لیکن سچائی سے بہت بعید ہے اگر ہم اپنے شرابی ہونے کا انکار کریں" (صفحہ ۱۵۱)

لندن محض شرابی نہیں، شرابیوں کا سردار ہے۔ مصنف اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے:۔

"کولون (فرانس) یا بارسلون (اٹلی) میں ہوٹلوں میں کافی پی پی کر آدھی آدھی رات گزاری جا سکتی ہے۔ اور میں نے گزاری ہے لیکن لندن میں یہ ممکن نہیں۔ لندن میں ہر پارٹی کا مطالبہ شراب کا رہتا ہے فلسفیانہ توجیہ اس کی جو کچھ بھی ہو، اور مطالبہ اُس کا پورا ہوتا رہتا ہے" (۱۵۷)

ان بدمستیوں کے نتائج جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ اور ان پر قلق و تأسف ہم کو، آپ کو، ساری کائنات انسانی کو ہونا چاہیئے۔

تہذیب لندنی کا یہ خاکہ ایک دوست، ہوا خواہ و ہمدرد کا کھینچا ہوا ہے کیا ہماری عبرت اور نصیحت کے لئے اس کے اندر سامان موجود نہیں؟

پردہ کے حدود

سچ کے ایک ممتاز عنایت فرما، حیدرآباد دکن سے تحریر فرماتے ہیں :-

"ایک زمانہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ سے عرض کروں، کہ پردہ کے مسئلہ پر توجہ فرمائی جائے۔ میری نالائقی مسلمہ ہے۔ مکروہاتِ دینوی کے ہجوم سے خود دریافت وتحقیق کی لیاقت نہ مہلت۔ آج کل عالم گیر خیال یہ پیدا ہو رہا ہے، کہ قرآن مبارک اور حدیث کی رو سے پردہ لازمی نہیں۔ اور امام غزالیؒ کے ارشاد کے بعد کہ الوجہ والکفان لا تدخل فی الستر۔ روشن خیال احباب کو گویا سند جواز مل گئی ہے ..... اس کی تشریح اور اس مسئلہ پر اگر آپ قلم اٹھائیں، تو بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی، اور میرے نزدیک اس مسئلہ پر لکھنے کی سخت ضرورت ہے رہا یہ کہ باعتبار معاشرت کس حد تک ہم کو پردہ اختیار کرنا چاہئے تو احکام قرآن واحکام احادیث کے بعد یہ ضرورت خود بخود باقی نہ رہے گی"

یہ ایک خط صرف بطور نمونہ دے دیا گیا۔ ورنہ اس موضوع پر لکھنے کی فرمایش اور اصرار ہر طرف سے اور بہ کثرت ہو رہا ہے۔ ملکۂ افغانستان کے اظہار خیال کے بعد سے مختلف اخبارات میں سلسلۂ بحث چل نکلا ہے۔ بعض مضامین سچ میں نقل بھی ہو چکے ہیں، جن میں سے دو مضمون مشاہیر علماء وقت

کے ہیں۔

جن عنایت فرما کا مراسلہ اوپر درج ہے ان کی تحریر میں اس موضوع پر اکثر دوسرے قلم اٹھانے والوں کی طرح کسی قدر غلط مبحث ہے۔ چہرہ اور کف دست کے داخل ستر نہ ہونے سے "بے پردگی" کی سند جواز کہاں سے مل جاتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ نتیجہ یہ نکلے گا، کہ یہ دونوں چیزیں پردہ کے حدود میں داخل نہیں۔ طبیب نے اگر مریض کو بعض غذاؤں کے کھانے کی اجازت دے دی ہے، تو اس کے یہ معنی تو نہیں، کہ مریض کے لئے اب کوئی پرہیز باقی نہیں رہا، اور ہر غذا کے لئے اُسے آزادی مل گئی ہے!

طبیب اگر مریض کو بعض غذاؤں سے روک دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ان غذاؤں کی ممانعت مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود اصلی مریض کی صحت ہے۔ اور چوں کہ طبیب کے علم و تجربہ میں بعض غذائیں اس مقصدِ صحت کے حصول میں روک پیدا کریں گی، اور ان کا ترک حصول صحت میں معین ہوگا، اس لئے وہ ان سے پرہیز کی ہدایت کرتا ہے۔ طبیب روحانی کو بھی اسی طرح صحت روحانی مقصود ہوتی ہے، وہ پرہیز کراتا ہے تو صرف اُنھیں اعمال و اشغال سے جن سے صحت روحانی کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے پس مذہب کی عائد کی ہوئی قیدیں اور پابندیاں صرف دیکھنے میں سختیاں معلوم ہوتی ہیں، ورنہ درحقیقت انسان کے حق میں وہ عین سہولتیں اور نرمیاں، راحتیں اور رحمتیں ہوتی ہیں۔ پردہ بھی "قید" صرف اُسی معنی میں ہے۔ مرد عورت کا باہمی میل جول ایک خاص حد کے اندر، دونوں کی تکمیل اور قوئ اخلاقی کی نشو و نما کے لئے مفید ہے۔ اس حد کے اندر کوئی ٹوک نہیں۔ اس حد سے باہر قدم رکھنا اپنی فطرت و سیرت کی تکمیل میں خلل ڈالنا اور اپنی اخلاقی صحت کو نقصان پہنچانا ہے، اعضاء جسم کو کھولنا یا چھپانا، بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ اہم مقصد کی ماتحتی میں ہے، اور اسی منظم طرز معاشرت کا نام پردہ ہے۔

پردہ سے اصلی مقصود اُس جوہر اخلاق کی حفاظت ہے جو شرفِ انسانیت ہے یعنی حفظ عصمت۔ اور تمام تدبیریں جو مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوں، سب

اسلامی پردہ کے حدود میں آجاتی ہیں۔ قرآن حکیم نے محض بدکاری ہی کو نہیں روکا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو اس جانب لے جائے، ناجائز و ممنوع ہے۔ لا تقربوا الزنا (بنی اسرائیل ع ۴) کا حکم نہایت عام و وسیع ہے "بدکاری" کے نزدیک نہ جاؤ"۔ محض یہ ارشاد نہیں کہ "بدکاری نہ کرو" بلکہ اس کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یعنی اُس کی نزدیکی بھی حرام، اور جو چیزیں بھی انسان کو اُس کے قریب اور نزدیک لاتی ہیں، سب ناجائز ہے۔ فحش راگ، فحش اشعار، فحش تذکرے، فحش تصویریں، غرض ہر ایسی شئے جو اس راہ میں آسانیاں پیدا کرے، اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے ممنوع ٹھیرادی ہے۔ تفصیلات ہر قوم اور ہر زمانہ کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں، سب کا احاطہ کیوں کر ہو سکتا ہے، لیکن اس اجمالی و اصولی حکم کے تحت میں سارے ذرائع آگئے۔ اب اگر کسی طبقہ یا گروہ کی اخلاقی و معاشری حالت اتنی پست و زبون ہوگئی ہے کہ اس میں کسی عورت کا چہرہ یا ہتھیلی کھل جانا ہی فتنہ کا سبب بن جاتا ہے، تو اُس سوسائٹی کے اندر ان اعضاء کا کھلنا بے شبہ جرم قرار پا جائے گا اور انھیں ڈھانپے رہنا اُسی طرح لازمی ہو جائے گا جس طرح وہ دوسرے اعضاء جن کے چھپانے کا حکم تصریح سے موجود ہے۔ رہا یہ امر، کہ کس ملک اور کس قوم کی اخلاقی حالت اس کی متقاضی ہے، سو اس کا فیصلہ کرنا وہاں کے ارباب حل وعقد اور علماء متدین کا کام ہے۔ قرآن مجید نے صرف ایک عام اصول بتا دیا ہے۔

اس عام و اصولی حکم کے علاوہ، پردہ سے متعلق چند احکام تفصیل و تصریح کے ساتھ بھی کلام مجید میں وارد ہیں۔ ان سب سے اہم و مقدم ہدایت یہ ہے، کہ مرد اور عورتیں

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ..... وقل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن (نور۔ ع ۴)

دونوں اپنی اپنی نظریں نیچی رکھا کریں، اور اپنی اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتی رہیں۔ گویا حفظ عصمت کے سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی یہی ہے، کہ مرد و عورت دونوں اپنی نظروں پر قابو حاصل کریں، اور اُنھیں نیچی رکھنے کی عادت ڈالیں۔ جو لوگ نفس بشری کے طریق کار سے واقف ہیں، یا نفسیات کا مطالعہ کرچکے ہیں، با آسانی

لہ۔ لا تقربوا الزنا بالعزم والاتیان بالمقدمات فضلا عن ان تباشروہ (بیضاوی)

سمجھ سکتے ہیں، کہ بد نظری کہ ممانعت، بدکاری سے روکنے میں کس بڑی حد تک معین ہو سکتی ہے، اور جس نے اپنی نظر پر قابو حاصل کر لیا، اس کے لئے اپنے دل پر اور اپنے قوائے شہوانی پر قابو حاصل کر لینا کس قدر آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن نظر کے قابو میں رکھنے کے اس اہتمام وتاکید سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے، کہ عورت و مرد کے ملنے کی یکسر ممانعت شاید قرآن مجید کا مقصود نہ ہو۔ نظریں نیچی رکھنے کی ضرورت۔ تو اسی وقت کے لئے ہے، جب دونوں جنسوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہوتا رہے، جب سرے سے نظر پڑنے ہی کا امکان نہیں، تو اس حکم کے لئے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟

یہ حکم مردوں عورتوں دونوں کے لئے عام ہے۔ اس کے بعد دوسری ہدایت جو مخصوص عورتوں کے لئے ہے، یہ ہے کہ اپنی زینت نہ ظاہر ہونے دیں، بجز اُن چیزوں کے جو اُس میں کھلی رہتی ہیں۔ عورت کی "زینت" سے اُس کے حسن وجمال

ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا (ایضا)	بناؤ سنگار، آرائش وزیبایش کی وہ تمام چیزیں مراد ہیں، جو مرد کی نظر میں اسے

خوشنما کر دکھاتی ہیں، اور مرد کے دل میں اس کے متعلق خواہش وتحریک پیدا کر سکتی ہیں۔ یہ "زینت" کا عام ووسیع مفہوم ہوا۔ لیکن سیاق عبارت چاہتا ہے، اور اکابر مفسرین اسی جانب گئے ہیں، کہ زینت سے یہاں مراد جسم کے مواضع زینت ہی ہیں۔

والمراد من الزینة موضع الزینة (بغویؒ)	زینت سے مراد موضع زینت ہے۔ (معالم التنزیل، بغویؒ)
والمراد من الزینة النظر الی مواضعھا من البدن (خازن)	زینت سے مراد جسم کے مواضع زینت پر نظر کرنا ہے۔ (خازن)
وذکر الزینة دون مواضعھا مبالغة فی الامر بالتصون والتستر (ابوحیان)	بجائے مواضع زینت کے، محض زینت یہاں اس لئے کہا گیا، کہ ان کے چھپانے اور ڈھانپنے پر زیادہ زور اور تاکید منظور تھا

(اس کے بعد اعضاء زینت کے نام گنائے ہیں، سر، سینہ، گردن، پنڈلی وغیرہ)

زینتھن، آرایش خود را، یعنی مواضع زیور را (شاہ ولی اللہ)	یہاں اپنی آرایش و زینت سے مراد مواضع آرایش ہیں۔ (فتح الرحمن، حضرت شاہ ولی اللہؒ)

گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ عورتیں اپنے جسم کے اُن حصوں کو، جو مرد کی نظر میں خواہش اور تحریک پیدا کر سکتے ہیں، چھپائے رکھیں، البتہ وہ حصے جو عادۃً یا ضرورۃً چار و ناچار کھلے رہتے ہیں[1]۔ اس حکم میں داخل نہیں (الا ما ظہر منہا) اب سوال یہ ہے کہ وہ مواضع زینت، وہ اعضاء جسم، جن کے لئے چھپانا ضروری نہیں، کون سے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں ما ظہر منہا کی تفسیر کیا ہے؟

اہل تفسیر کے درمیان اس باب میں اچھا خاصہ اختلاف ہے بعض نے اس سے مراد لباس لیا ہے، اور بعض نے ظاہری بناؤ سنگار کی دوسری چیزیں مثلاً سرمہ، انگوٹھی، وغیرہ لیکن لفظ "زینت" کا اگر وہ مفہوم صحیح ہے، جو اوپر درج ہو چکا، یعنی "زینت" سے مراد مواضع زینت اور اعضاء جسم ہیں، تو ظاہر ہے کہ اعضاء جسم سے استثنا بھی اعضاء جسم ہی کا ہو گا، اور (الا ما ظہر منہا) "جو چیزیں کھلی رہتی ہیں" سے مراد جسم ہی کے بعض حصے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ تفسیر میں سے بعض مشاہیر اسی جانب گئے ہیں، اور تفاسیر ابن جریرؒ، معالم، خازن، بحر المحیط وغیرہ میں حضرت سعید بن جبیر حسن بصری، ضحاک، و امام اوزاعی رحمہم اللہ سے صاف منقول ہے، کہ ان کھلی ہوئی چیزوں سے، جنھیں قید پردہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مراد، الوجہ و الکفان، چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں!

امام ابن جریر، صحابہ، تابعین، و تبع تابعین کے مختلف و متعدد اقوال و روایات نقل کر کے بالآخر اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سناتے ہیں:۔

واولی الاقوال فی ذلک بالصواب قول من قال عنی بذالک الوجہ والکفان	ان سب اقوال میں صحیح ترین قول ان کا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔

---

[1] الا ما ظہر منہا یعنی الا ما جرت العادۃ والجبلۃ علی ظہورہ (ابو حیانؒ)

الا ما یظہرہ الانسان فی العادۃ الجاریۃ (قفال)

متقدمین میں سب سے بڑے مفسر کے اس فیصلہ کے ساتھ متوسطین میں صاحب جلالین کے بھی اس قول کو ملاتے چلئے، کہ

الا ما ظہر منہا، وھوالوجہ والکفان	الا ما ظہر منہا سے مراد چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں۔

متاخرین بھی اس باب میں متقدمین و متوسطین سے الگ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے فارسی ترجمہ قرآن میں الا ما ظہر منہا کا ترجمہ کرتے ہیں۔ "الا آنچہ ظاہر است ازیں مواضع" اور اس کی توضیح حاشیہ فتح الرحمن میں کرتے ہیں، کہ ان

یعنی وجہ وکفین	کھلے ہوئے مقامات سے مراد چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں!

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے الفاظ بھی تقریباً بالکل یہی ہیں:۔

الا آنچہ ظاہر است ازاں مواضع یعنی وجہ وکفین (تفسیر عزیزی دہلی صفحہ ۴۰)	بجز اُن مقامات کے جو کھلے ہوئے رہتے ہیں، یعنے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں

اکابر تفسیر کی ان تصریحات کے بعد کم سے کم اس بدگمانی کا تو موقع نہیں کہ چہرے اور ہتھیلیوں کو پردہ سے باہر رکھنا بیسویں صدی عیسوی کی جدت ہے۔ یہ اگر تفسیر بالرائے ہے تو اس جرم میں حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، ضحاک، اوزاعیؒ، ابن جریرؒ و صاحب جلالینؒ سے لے کر شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ تک سب شریک ہیں۔ ان ائمہ تفسیر کے علاوہ ہر مذہب کے فقہاء کے ہاں بھی یہ صراحت موجود ہے، کہ چہرہ اور ہاتھ (اور بعض کے نزدیک پیر بھی) داخل ستر نہیں۔ قاضی القضاۃ ابن رشد مالکی اندلسی، جو چاروں مذاہب فقہ کے ایک معتمد و مستند عالم تھے لکھتے ہیں۔

واما المسئلۃ الثالثۃ وھی حد العورۃ فی المرأۃ، فاکثر العلماء ان بدنہا کلہا عورۃ ما خلا الوجہ والکفین وذھب ابوحنیفتہ الی ان قدمہا	تیسرا مسئلہ یہ ہے، کہ عورت کے ستر کے حدود کیا ہیں۔ تو اکثر علماء کا قول ہے، کہ اس کا سارا جسم ستر ہے بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت

لیست بعورۃ (بدایۃ المجتہد، مصر، جلد اول صفحہ ۹۰) | کے پیر بھی ستر سے باہر ہیں۔

فقہ حنفی پر آج جس قدر مستند و متداول کتابیں ہیں، ہدایہ، کنز، در مختار اور ان کے شروح و حواشی، سب میں یہ جزئیہ درج ہے، کہ عورت کے ستر سے اُس کا چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں۔ بعض علماء حال نے اپنی تحریروں میں یہ قید لگادی ہے، کہ اس ستر سے مراد صرف حالت نماز کا حکم ہے، لیکن اس قید کی دلیل اب تک تلاشی سے بھی نہ مل سکی، اور نہ ایسی تخصیص کتاب و سنت سے نکلتی معلوم ہوتی ہے۔

اہل تفسیر کی تشریحات اور فقہاء کے قیاسات قطع نظر کرکے، خوش قسمتی سے خود سرورِ کائنات کی ایک فیصلہ کن حدیث اس باب میں موجود ہے، جس کے بعد پھر کسی مزید بحث کی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی۔

عن عائشۃ ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علیٰ رسول اللہ صلعم وعلیھا ثیاب رقاقٌ فاعرض عنھا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن یصلح ان یری منھا الا ھذا وھذا واشار الی وجہ وکفیہ (مشکوٰۃ کتاب اللباس بحوالہ ابو داؤد)

عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رسول خدا صلعم کے پاس آئیں اور بہت باریک لباس اُن کے جسم پر تھا۔ پس آپ نے ان کی طرف سے منھ پھیرلیا، اور فرمایا کہ اے اسماء جب عورت جوان ہوجائے، تو پھر درست نہیں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے، بجز اس کے اور آپ نے اپنے چہرہ اور ہتھیلیوں کو اشارہ سے بتایا۔

ارشاد مبارک بالکل صاف و صریح ہے۔ چہرہ اور کف دست کو ستر سے باہر رکھنے کا ارشاد عام اور مطلق صورت میں ہے، حالت نماز وغیرہ کسی قسم کی قید نہ الفاظ میں ہے، نہ سیاق میں سے نکلتی ہے۔ اس واضح فرمان کے بعد کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور الا ما ظہر منہا کی تفسیر بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

پردہ مروجہ کی حامیوں کی طرف سے ایک عقلی اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب چہرہ ہی کے، جو اصل محل فتنہ ہے، کھلے رکھنے کی اجازت مل گئی، تو پھر باقی جسم کے ڈھکے رہنے سے کیا نتیجہ؟ لیکن یہ اعتراض کچھ بھی قوت نہیں رکھتا۔ اول تو جب نص حدیث چہرہ کے کھلے رہنے کی بابت مل گئی، تو اس کے معاوضہ و مقابلہ میں اس قسم کی قیاسی موشگافیاں سرے سے قابل توجہ ہی نہیں۔ دوسرے، جس خطرہ کو سوال میں پیش کیا گیا ہے، تجربہ کی شہادت ہے، کہ وہ خطرہ بھی درست نہیں۔ چہرہ سے مراد صرف چہرہ ہی ہے، نہ کہ چہرہ کے حوالی و اطراف اور جس شئے کے کھلے رہنے کی اجازت ملی ہے، وہ صرف آنکھیں، ناک، منھ اور رخساروں کا ایک حصہ ہے، جسے ٹھیٹھ اُردو میں "چہرہ کی ٹکیا" کہتے ہیں۔ کان، گلا، کنپٹی، سر، پیشانی کا اوپری حصہ، ان میں سے کسی شئے کے کھلے رکھنے کی اجازت نہیں چہرہ میں حسن و زیبائش اور مرد کے لئے کشش اُسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب چہرہ کو آزادی کے ساتھ مع اس کے اطراف و حوالی کے کھول دیا جائے، اور نظریں بجائے نیچی ہونے کے اونچی ہوں، لیکن اگر سر و گردن وغیرہ سب احتیاط سے ڈھکے ہوں، آنکھیں حیا کے ساتھ جھکی ہوئی ہوں، تو محض چہرہ کی ٹکیا کھلے رکھنے سے فتنہ کا مطلق اندیشہ نہیں حسن و دلکشی پیدا کرنے والی شئے اعضاء کا تناسب ہے، لیکن اگر یہ تناسب چھپا ہوا رہے۔ گرد و پیش کے اعضاء، جو تناسب پیدا کرتے ہیں، اُن سب پر پردہ پڑا رہے، تو محض چہرہ کی ٹکیا، اور وہ بھی نیچی اور حیادار نظروں کے ساتھ، ایک بالکل بے ضرر شئے ہے۔

تیسرا حکم پردہ کے سلسلہ میں یہ ملتا ہے کہ عورتوں کو بالائی حصہ جسم کا لباس ایسا اختیار کرنا چاہیئے، جو ان کے مقامات زینت کو خاص طور پر ڈھانپ لے۔ ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن یعنی اپنی اوڑھنیوں سے وہ اپنے گریبانوں کو خوب چھپائے ہوئے رہیں۔ خمار اُس اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر ڈھانپنے کے لیئے ہوتی ہے۔ یہاں ارشاد ہوتا ہے، کہ اس اوڑھنی سے محض سر ہی کو نہ چھپایا

جائے بلکہ اُسے اس طرح اوڑھا جائے، کہ گریبان (جیوب) تک اُس سے چھپ جائیں۔ یعنی سر کے بال، کان، گردن، شانہ، سینہ، کا کوئی حصہ کھلا نہ رہے، اور یہ سب پردہ میں آجائیں۔ فتنہ کا جو اندیشہ چہرہ کے کھلا رکھنے سے ممکن تھا، اس کا پورا سدِّ باب اس حکم سے ہو جاتا ہے۔ اسی ہدایت کو زیادہ موثر و مؤکد بنانے کے لئے چوتھا ارشاد، ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے ساتھ عام مومن عورتوں کو یہ ہوتا

یاایہا النبیُ قل لازواجك و بناتك ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن۔ ذلك ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین

ہے، کہ باہر نکلتے وقت وہ اپنی چادریں اپنے اوپر ذرا نیچی لٹکا لیا کریں، تاکہ پہچان لی جائیں، کہ وہ پارسا و باعفت عورتیں ہیں۔ اور چھیڑ چھاڑ سے اُنھیں ایذا نہ پہونچائی جائے۔

آیت کی جو شان نزول، احادیث صحیحہ کی بنا پر تمام تفسیروں میں منقول ہے اس نے "باہر نکلتے وقت" کی قید کو ضروری بنا دیا ہے۔ اور عقلاً بھی چادر لپیٹنے یا گھونگھٹ نکالنے کی ضرورت اسی وقت ہو سکتی ہے، جب باہر نکل کر مردوں کا سامنا ہونے کا موقع ہو۔ جلباب کے عام لغوی معنی قمیص اور خمار کے ہیں[1]۔ اور اردو و فارسی کے مترجمین قرآن نے عموماً اس کا ترجمہ "چادر" سے کیا ہے، لیکن صاحب تاج العروس نے لسان العرب کے حوالہ سے اس کے معنی اُس کپڑے کے لئے ہیں، جس سے

تغطی به المرأة رأسها وصدرها

عورت اپنا سر اور سینہ چھپائے رکھتی ہے گویا چہرہ چھپانے والے کپڑے کا مفہوم لغت سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔

پھر امام ابن جریرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اوناء جلباب کی شرح میں جو مختلف اقوال نقل کئے ہیں، اُن میں سے حضرت عباسؓ کا جو قول محمد بن سعد کے واسطہ سے منقول ہے اس میں جلباب کو صرف پیشانی پر باندھنا مذکور ہے، چہرہ کے چھپانے کا ذکر نہیں۔ غرض تیسری اور چوتھی آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اصلی تاکید، جاہلیتِ عرب و جاہلیتِ فرنگ کی بے حیا عورتوں کے دستور اور فیشن کے برعکس، مومن عورتوں

---

[1] والجلابیب، والقمص والخمر (راغب)

کو اس کی ہے۔ کہ باہر نکلتے وقت، اور غیر مردوں کا سامنا ہوتے وقت، چہرہ کے حوالی و اطراف، سر، پیشانی، گردن، شانہ و سینہ وغیرہ کو ڈھکا ہوا رکھیں، اور بالکل ظاہر نہ ہونے دیں۔ اصلی پردہ انھیں اعضا کا پردہ ہے۔ اور اگر ادنائے جلباب میں چہرہ چھپانے کا مفہوم داخل بھی سمجھا جائے تو یہ حکم عام اور مطلق نہ ہوگا، بلکہ محض چھیڑ چھاڑ اور ایذا سے بچنے کے لئے ہوگا، جیسا کہ خود آیت میں تصریح موجود ہے۔ اور صرف انھیں حالات میں واجب العمل ہوگا، جب چہرہ کھلنے سے فتنہ کا دروازہ کھل رہا ہو۔

اسی اخفاء زینت کی تاکید میں ایک اور آیت بھی آئی ہے۔ جسے پردہ کے سلسلہ میں پانچویں آیت شمار کرنا چاہیئے۔ اس میں مسلمان عورتوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے

ولا یضربن بارجلھن لیعلم مایخفین من زینتھن

کہ اپنے پیروں کو زمین پر اس طرح نہ رکھیں، جس سے، اُن کی چھپی ہوئی زینتیں ظاہر ہو کر رہیں۔ عام مفسرین نے پیر کی زینتوں سے مراد صرف پیر کے زیوروں سے لی ہے، لیکن کلام پاک کے الفاظ اس قدر وسیع و جامع ہیں، کہ وہ ہر فتنہ جو عورتوں کی رفتار سے پیدا ہو سکتا ہے، ان کا ناز و انداز سے چلنا، ناچ گھروں میں ان کا تھرکنا، قواعد رقص کے مطابق ان کا پیروں کو حرکت دینا، ساق کی خوشنمائیوں کو ظاہر کرتے رہنا، غرض عورت کی ٹانگوں کے ذریعہ سے مرد کو لبھانے والی وہ ایجادیں جو آج فرنگی دماغ کر چکے ہیں، اور جو کل عرب جاہلیت میں رائج تھیں، سب اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔

اسی کے ساتھ جو فتنہ نرم آوازی کی بنا پر پیدا ہو سکتا ہے، اور عورت کی کی ملایم و شیریں آواز سن کر مرد کے دل میں جس طرح تحریک پیدا ہو سکتی ہے، اس کا

فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا

خصوصیت سے سد باب کیا ہے، لیکن اس احتیاط کے ساتھ دوسری طرف عورت کی آواز کو پردہ کے حدود میں داخل نہیں کیا گیا ہے، یعنی یہ ارشاد نہیں ہوتا، کہ عورت سرے سے اپنی آواز ہی

غیر مرد کو نہ سننے دے، بلکہ حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ غیر محرموں سے کلام کے وقت وہ لب و لہجہ ایسا نہ رکھیں، جس سے کوئی فتنہ پیدا ہو سکے۔ یہ آیہ کریمہ خاص اُمہات مومنین سے متعلق ہے۔ لیکن جب امت کی اُن ماؤں پر، جن پر اُن کے علوے مرتبت و کمال تقویٰ کی بنا پر بہت زیادہ قیدیں لگائی گئی ہیں، آواز کا پردہ فرض نہیں ہوا تو عام مومنات کے لیے جنھیں اپنی روزانہ ضروریات کے لیے غیروں سے گفتگو کی بہت زیادہ ضرورت پیش آتی رہتی ہے، کوئی ایسا حکم اور بھی غیر ضروری ہے۔

غرض نگاہیں نیچی رکھنے، شرم و حیا کو اپنا شعار بنائے رہنے، چال ڈھال، بات چیت میں انتہائی احتیاط برتتے رہنے، جسم کے جو حصے محل فتنہ بن سکتے ہیں، ان سب کو چھپائے رکھنے کے احکام، کلام مجید میں تصریح و تکرار کے ساتھ وارد ہیں۔ اور یہی اسلامی پردہ کے حدود ہیں۔ جو عورتیں انھیں توڑنا چاہتی ہیں، نامحرموں سے آزادی و بے تکلفی کے ساتھ میل جول کی آرزومند ہیں، فرنگنوں کا موجودہ لباس زیب تن کرنا چاہتی ہیں، وہ یقیناً اسلامی پردہ کے حدود سے اپنا قدم باہر نکال چکیں۔ ان کی حالت پر افسوس، اور اُن کے حق میں دعائے خیر کے علاوہ کچھ چارہ نہیں۔ لیکن چہرہ اور آواز اور کف دست کو بھی لازمی طور پر ان حدود کے اندر شامل رکھنا، نہ کتاب اللہ کی کسی آیۂ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے نہ سنتِ رسولؐ سے۔ واللہ اعلم و علمہٗ احکم۔

یہ ساری گفتگو جسم عورت کے متعلق تھی۔ لیکن اسی کی مساوی اہمیت کا ایک دوسرا سوال، کم سے کم ہندوستان کے بعض صوبوں اور علاقوں میں "چار دیواری کے پردہ" نے پیدا کر دیا ہے۔ پردہ شکن جماعت کا یہی سب سے بڑا اعتراض اس پر ہے اور حامیان پردہ کا بھی عام طبقہ عورتوں کی اسی خانہ نشینی ہی کو اصلی اسلامی پردہ سمجھے ہوئے ہے۔ قرآن پاک میں اس بحث سے متعلق صرف ایک آیت ملتی ہے اور اسی سے حامیانِ پردہ استدلال و استشہاد کرتے ہیں۔ ازواج مطہرات کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے، کہ

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیۃ الاولیٰ

اپنے گھروں میں قرار پکڑے رہو اور جاہلیت اولیٰ کی طرح اپنا سنگار دکھاتی نہ پھرو۔

جاہلیتِ عرب میں، ٹھیک آج کل کی فرنگنوں کی طرح، عورتوں کے لیے نیم برہنہ لباس کے اور اپنے حسن و جمال کی نمایش کرتے رہنے کا دستور عام تھا آیۂ بالا کے دوسرے حصہ میں اس سے روکا ہے اور پہلے حصہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وقرن فی بیوتکن۔ اس ارشاد کا پہلا لفظ بجائے خود بحث طلب ہے عام مفسرین نے قرن کو قرار سے مشتق قرار دے کر اقررن کے بجائے سمجھا ہے اور اس کے معنی قرار پکڑنے، سکونت اختیار کرنے، اور ٹھہرے رہنے کے لیے ہیں لیکن بصرہ اور کوفہ کے عام قاریوں کے نزدیک، صحیح قرأت بجائے قرن (بفتح قاف) کے قِرن (بکسر قاف) ہے، جس کا مصدر "قرار" نہیں، "وقار" ہے، اور معنی یہ ہیں، کہ متانت و وقار سے رہو۔ محققین ائمہ تفسیر نے اسی پہلو کو ترجیح دی ہے۔ امام جریر لکھتے ہیں

واختلفت القراء فی قرأۃ قولہ وقرن فی بیوتکن وقراء ذلک عامۃ قراء الکوفہ والبصرۃ وقِرن بکسر القاف بمعنی کُنّ اھل وقار وسکینۃ فی بیوتکن وھذہ القراۃ وھی الکسر فی القاف اولیٰ عندنا بالصواب

قاریوں کا اس آیت کی قرأت کے بارے میں اختلاف ہے بصرہ اور کوفہ کے عام قاریوں نے اسے قِرن (بکسر قاف) پڑھا ہے، جس کے معنی ہیں کہ اپنے گھروں میں وقار و سکینۃ اختیار کرو اور یہی قرأت یعنے بکسر قاف ہمارے نزدیک صحیح تر ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے بھی قِرن کے اشتقاق میں کئی قول نقل کیے ہیں، اور ان میں سب سے پہلے اسی کو لکھا ہے، کہ وقر یقر وقاراً سے مشتق ہے۔ اور بغویؒ نے تفسیر معالم التنزیل میں مختلف اقوال اور قرأتیں نقل کرکے قول اصح اسی کو قرار دیا ہے

وھوالاصح انہ امر من الوقار کقولھم من الوعد عدن، ومن الوصل

کہ یہ مصدر "وقار" سے صیغۂ امر ہے جیسے "وعد" سے عدن "وصل" سے

صلن ای کن اھل وقار وسکون	"صلن" اور معنی یہ ہیں کہ اہل وقار وسکون بن جاؤ۔

اسی طرح خازن نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔

وقیل ھو امر من الوقار ای کن اھل وقار وسکون	ایک قول یہ ہے کہ یہ "وقار" سے امر ہے یعنے اہل وقار وسکون بن جاؤ

اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی تفسیر میں بھی پہلے یہی قول نقل ہوا ہے کہ

قوله وقرن، یعنی بہ وقار باشید درخانہائے خود (صفحہ ۲۰ مطبوعہ دہلی)	قرن کے معنی ہیں "اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو۔

اہل لغت کی شہادت بھی اس باب میں اسی فریق کا پلہ جھکا رہی ہے جو آیۂ کریمہ کے معنی وقار وسکون سے رہنے کے قرار دے رہا ہے۔ چنانچہ راغب اور صاحب تاج العروس دونوں نے آیۂ مذکور کو لغت "وقر" و "وقار" ہی کے تحت میں نقل کیا ہے۔

ان سب شہادتوں کی تائید سیاق عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ جب آیت کے ایک ٹکڑے میں "تبرج" یعنی حسن وجمال کی نمایش سے روکا ہے، تو قرینہ یہ ہے کہ آیت کے دوسرے ٹکڑے میں، اس کے بالمقابل وقار و تمکنت کی تاکید ہو ایک طرف بیحیائی اور چھچھوراپن ہے، اور دوسری طرف وقار و تمکنت۔ مقابلہ اور جوڑ انھیں چیزوں کا ہے۔ صحیح تضاد وتقابل، تبرج و وقار ہی کے درمیان ہے۔

پھر اگر اس حکم سے مراد خانہ نشینی ہی لی جائے تو بعض اکابر علماء کا خیال ہے کہ یہ حکم امہات مومنینؓ کے لیے مخصوص ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اُس حدیث عائشہؓ کی شرح میں، جس میں رسول اللہ صلعم نے حضرت اسماء کو باریک لباس سے منع فرمایا، اور جو اوپر نقل ہو چکی ہے، لکھتے ہیں، کہ

ایں ستر عورت ست مرزن راو حجاب آنست کہ از خانہ پیش مردم بیرون نیاید اگرچہ پوشیدہ باشد و آں خراص ازواج	یہ (یعنی بجز چہرہ اور کف دست کے باقی جسم کو چھپائے رکھنا) تو ستر عورت ہوا۔ اور حجاب اسے کہتے ہیں کہ باوجود لباس ستر پوش کے عورت گھر سے باہر نکل کر

مطہرہ آنحضرت ست (شرح مشکوٰۃ) | مردوں کے سامنے نہ آئے اور یہ آنحضرت

صلعم کی ازواج مطہرات کی خصوصیات میں سے تھا۔

اور پھر ان مقدس بیویوں کے لئے بھی خانہ نشینی کا حکم مطلق و غیر مشروط صورت میں نہیں، بلکہ ضرورتوں کے لئے انھیں بھی گھر سے باہر نکلنے کی اجازت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

قد اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

تمھارے لئے اجازت ہے، کہ تم اپنی ضرورت کے لئے باہر نکل سکتی ہو۔

چنانچہ ازواج نبی رضی اللہ عنہن کا طرز عمل بھی اسی تعلیم کے مطابق تھا۔ بلا ضرورت گھومتے رہنے سے وہ بلا شبہ بالکل محتاط تھیں۔ خواہ مخواہ باہر کی سیر کرتے رہنا، انھوں نے اپنے لئے قطعاً حرام رکھا تھا۔ لیکن آخر حج کرنے جاتی تھیں، صحابہ تابعین کو احادیث رسول سناتی تھیں اور حضرت بی بی عائشہؓ نے واقعہ جمل میں طویل سفر اور فوج کی رہنمائی بھی اختیار کر لی تھی۔ مشہور محدث حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

قد کن بعد النبی صلعم یحججن ویطفن وکان الصحابۃ ومن بعدھم یسمعون منھن الحدیث وھن مستترات الابدان لا الاشخاص (فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۳۰ مصری)

ازواج مطہرات، رسول اللہ صلعم کے بعد حج کرتی رہیں، طواف کرتی رہیں، اور صحابہ اور ان کے بعد والوں سے روایت حدیث کرتی رہیں۔ ان کے بدن ڈھکے ہوئے رہتے تھے، لیکن وہ خود پردہ میں نہ تھیں۔

ان تمام مجموعی شہادتوں پر نظر کرنے کے بعد یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے، کہ عورت کے لئے گوشہ نشینی یا پردہ نشینی اسلامی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔

عورت کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند کر دینے کا حکم کلام مجید میں صرف ایک مقام پر ہے، اور وہ بطور سزا کے ہے، وہ سزا بے حیائی یا آوارگی کی ہے۔

والّٰتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم | عورتیں بے حیائی کی مرتکب ہوں، اور

فاستشهدوا علیهن اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت

چار گواہ گواہی دینے والے مل جائیں ان کے لئے ارشاد ہے کہ انہیں گھروں میں بند رکھو۔ یہ حکم قرآن پاک کے ہر حکم کی طرح، ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لئے ہے۔ آج یہی بے حیا عورتوں کا سزا ہٗ تادیباً اگر گھروں سے باہر قدم نکالنا روک دیا جائے تاکہ نہ خود مزید بے حیائیوں میں مبتلا ہو سکیں، اور نہ ان کا زہر دوسروں تک متعدی ہو سکے، تو یہ عین اسی حکم ربانی کی تعمیل ہو گی۔

غرض، جہاں تک آیاتِ قرآنی وسنت رسولؐ کا تتبع کیا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ اسلام نے مومن عورتوں کو، پردہ کے سلسلہ میں احکامِ ذیل کا پابند لازمی طور پر بنایا ہے:۔

(۱) نگاہیں نیچی رکھیں۔

(۲) لباس ساتر پہنیں۔ نہ باریک ہو جس سے جسم نظر آئے، اور نہ مختصر ہو جس سے کوئی مقام زینت کھُلا رہے۔

(۳) چال ڈھال، بات چیت، ہر شئے میں شرم وحیا، عفت وعصمت کو اپنا شعار رکھیں۔

(۴) بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے اپنے سارے جسم کو نامحرموں کی نظر سے چھپائیں۔

(۵) باہر نکلیں تو گھونگھٹ نکال کر، یا ایسا برقعہ پہن کر، جس سے چلنے پھرنے یا کام کاج کرنے میں ہرج نہ ہو۔

(۶) باہر صرف ضرورۃً نکلیں۔ بلا ضرورت دوکانوں کی سیر، کلبوں کی نشست پارکوں میں گلگشت ناجائز وممنوع۔

(۷) نامحرم کے سامنے ہر حال میں اپنے وقار وتمکنت، عزت وخودداری کو قایم رکھیں جس سے اُس کے دل میں کسی بدی کی ہمت ہی نہ پڑنے پائے۔

پہ چہرہ کا پردہ اور چار دیواری کا پردہ، میری ناقص، فہم و محدود بصیرت میں لازمی اور قطعی طور پر، کتاب وسنت سے نہیں نکلتا[ا]۔ البتہ جہاں فتنہ کا امکان قوی، یا احتمال ہو، وہاں یہ قیود، اور ان کے علاوہ دوسری پابندیاں بھی ضروری ہو جائیں گی۔ اسلام نے ان پابندیوں سے روکا ہرگز نہیں ہے، لیکن، میرے علم میں، ان پابندیوں کو لازمی بھی نہیں کیا ہے، بلکہ عام اصول اور چند لازمی قواعد بنا کر، ان قیود کو ملک و قوم کی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ سوال، کہ کس ملک اور قوم کی حالت، ان قیود کو کہاں تک لازمی کر رہی ہے، اصل موضوع سے علحدہ ہے۔ اس کا تصفیہ کرنا، جیسا شروع مضمون میں عرض کیا جا چکا ہے، ہر ملک و قوم کے فہمیدہ اہل حل وعقد وعلماء متدین کا کام ہے۔ اللہ اعلم وعلمہٗ احکم۔

[ا] ۔ مصالح عقل کا مقتضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اور چار دیواری کے پردہ کو لازمی نہ قرار دیا جائے اس لئے کہ اس حکم کی عالمگیر تعمیل تقریباً محال ہے۔ کاشت کاروں کی عورتوں کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ اپنے خاوندوں کو کھیت کے کام میں جا کر مدد نہ دیں؟ نائی، دھوبی، مہتر، کمہار، وغیرہ جتنے خدمت پیشہ طبقے ہیں، اُن سب کی عورتیں اپنے پیشے کی خدمات کے لئے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح وہ ساری عورتیں جنھیں اپنے ہاتھ سے سودا خرید کرنا یا فروخت کرنا ضروری ہے۔ ان سب طبقات کی عورتوں کے نکل جانے کے بعد مسلمان عورتوں کی کتنی قلیل تعداد باقی رہ جاتی ہے جو رواجی پردہ کی پابندیاں برداشت کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن صوبوں میں عورتوں کے باہر نکلنے کا رواج زیادہ ہے ان کا تو ذکر ہی نہیں، جن صوبوں میں پردہ بہت زیادہ سخت ہے، مثلاً صوبہ متحدہ، وہاں بھی بجز خوش حال شرفاء کے اور کسی طبقہ کی عورتوں کے لئے گھروں کے اندر پردہ میں بیٹھے رہنا ممکن نہیں۔

ایک مغربی کی مشرقیت

کوئی دو سال اُدھر کا ذکر ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک ضخیم و مستند کتاب ہندوستان پہنچی، عنوان LOVE MARRIAGE JEALOUSY (محبت، ازدواج، رقابت) موضوع، عنوان ہی سے ظاہر۔ ضخامت ۳۹۸ صفحات۔ کتاب کی تالیف میں متعدد ماہرین فن شامل۔ کتاب بیس بابوں میں تقسیم، ہر باب ایک ایک ماہر فن کے قلم سے نکلا ہوا۔ اور ان ماہرین میں مرد ہی نہیں، خواتین بھی شریک، زیادہ تر پیرس، لندن، برلن، ویانا، بوڈاپسٹ، اسٹاکھام، اور دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ۔ مرتب اعلیٰ لندن کے ڈاکٹر فوربا تھ۔ کتاب میں بہترین مقالات پروفیسر مورسین اسٹاکھام اسا کا یونیورسٹی کے قلم سے ہیں۔ ذیل میں موصوف کے ایک مقالہ "نارمل سیکسے لیٹی" (طبعی جنسیت) کا ضروری ملخص جا بجا سے درج ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ تمدن جدید کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ مرد و عورت اس آزادی کے ساتھ اور ایسے ہیجان پرور ماحول میں ملتے جلتے رہتے ہیں کہ گزشتہ نسلوں کو اس کا خیال بھی نہ تھا آج کی سوسائٹی میں کھیل تماشوں کا شوق جس حد تک بڑھ گیا ہے، اس نے رومی زمانہ کے شوق سیاحی کو بھی مات کر دیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج تماشے سب سے زیادہ مقبول وہی ہیں جن میں مرد و عورت دونوں ہی حصہ لے رہے ہوں، دونوں کے درمیان حجاب، جو پچھلی نسلوں کا طرۂ امتیاز تھا آج مفقود ہو چکا ہے، پہلے مرد و عورت اگر بعض تماشوں، مثلاً رقص میں اکٹھا ہوتے بھی تھے، تو

احتیاطیں اور تدبیریں ایسی کرلی جاتی تھیں، کہ کوئی شہوانی فتنہ بڑھنے نہیں پاتا تھا۔

اب صورت حال بالکل برعکس ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ "نگراں" کے رہنے کی رسم ہی مٹ چکی ہے، نہ اس کی احتیاط باقی رہی ہے کہ ناچ میں شرکت جانے بوجھے شریف زادے ہی کریں، اور وہ بھی "نگراں" کی نگرانی میں۔ پھر خود رقص کا طریقہ بھی روز بروز زیادہ ہی شہوانی ہوتا چلا گیا ہے۔ رقص خواہ وہ کسی زمانہ کا اور کسی صورت سے ہو، یوں بھی اُس سے بڑھ کر کوئی چیز محرک شہوت نہیں۔ ہم آغوشی کی لذت، اور اسی حالت میں مخصوص جسمانی حرکتیں، پھر نشاط انگیز راگ، بجز کسی خواجہ سرا کے، کون مرد ایسا ہوگا جس کی آتشِ شہوت بھڑک نہ اٹھے؟ رقص کا شوق، خواہ وہ شوق تماشائے رقص کا ہو یا خود ادائے رقص کا اصلاً ایک جنسی ہی شوق ہے۔ ممکن ہے اس حقیقت سے، ناگواری کے ساتھ انکار کردیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض افراد کو شعوری طور پر اس کا پورا احساس نہ ہو، لیکن بہرحال ہے اس شوق کی بنیاد جنسی ہی، مردوں عورتوں دونوں میں۔ اس متحرک ہم آغوشی میں ایسی شدید لذت محسوس ہوتی ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کو بارہا اس حال میں انزال ہو ہو گیا ہے!

کھیل بھی مخلوط قسم کے بہت سے ایسے نکلے ہیں جن سے جذبات شہوانی کو برابر تحریک ہی ہوتی رہتی ہے۔ ٹینس اور گالف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موٹر کے رواج نے "تخلیہ" کے بہترین مواقع فراہم کردیے ہیں۔ اور امریکی زبان میں "بوس و کنار پارٹیاں" تو گویا انھیں کے دم سے قائم ہیں۔ ان طرح طرح کی "تفریحوں" یہ محرک نفس، اور مہیج شراب کے دور مستزاد۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگلستانی اور امریکی سوسائٹی میں ایسے سن کے بچوں میں اور ان سے بڑھ کر بچیوں میں قوائے شہوانی بیدار ہوجاتے ہیں کہ اگلوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

مغربی تہذیب کی ایک جدید اور روز افزوں خصوصیت، مخلوط غسل اور اُس کے متعلقات ہیں۔ مثلاً سمندر کے کنارے جاذب نظر نیم برہنہ لباس میں گلگشت۔ اکثر انسانوں کے لئے یہ دونوں چیزیں انتہائی شہوت انگیزی کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ

خوب خیال رہے کہ جہاں تک شہوت انگیزی کا تعلق ہے، تمدن جدید کی نیم عریانی، وحشیوں کی کامل عریانی سے بالکل مختلف ہے۔ برہنگی پر جو میری مستقل تصلیف ہے اُس میں میں لکھ چکا ہوں کہ برہنگی بجائے خود ذرا بھی مہیج نفس نہیں۔ اس کی ساری شہوت انگیزی کا راز رواج لباس ہے۔ بے لباسی صرف لباس کے مقابل میں اثر تحریک شہوت کا رکھتی ہے۔ یہ تو کچھ ڈھکا کچھ کھلا ہوتا ہے جو قلب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے اور اس کا تجربہ جب دل چاہے، کیا جا سکتا ہے سڑکوں پر مجمع آخر کن عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہے؟ وہی جو خوب بنی ٹھنی، بہترین فیشن کے لباس میں چٹک مٹک دکھاتی چلتی ہیں، نہ کہ اُن کے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے، دبی سکڑی ہوئی راہ طے کرتی رہتی ہیں۔

آج کی نوجوان بن بیاہی خاتون نے مَردوں کے رجھانے، لبھانے کے فن میں درجۂ کمال حاصل کر لیا ہے وہ اس شہوانی دلکشی کا نام جو چاہے رکھ لے، اور چاہے واقعی اس کو اس کی خبر بھی نہ ہو، لیکن ہے یہ واقعہ کہ اب وہ دلبری و دلربائی کے فن میں ویسی ہی طاق ہو گئی ہے جیسی [لندن کی معروف و بدنام گلی] پکیڈلی کی کوئی لکھا جیسوا ہو سکتی ہے۔ عورت کا موجودہ لباس غسل اپنی اصل ضرورت وغایت کے پورا کرنے کے لحاظ سے جیسا بھی کچھ ہو، عورت کی رعنائی و دلکشی کے بڑھانے کا ذریعہ تو بہر حال ہے۔

عورت کی "آزادی" نے بھی خواہ وہ معاشی اعتبار سے ہو یا معاشری یا جنسی اعتبار سے، اُس کی رعنائی لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ پھیلا رکھی ہے اور ساتھ ہی اس کے انتہائی مواقع بھی فراہم کر رکھے ہیں، کہ وہ اپنی شہوت پرستی کے جذبات کو خوب جی بھر کے تسکین دے سکے اب وہ شادی کی محتاج نہیں، اور اس کی ضرورت تو اُسے اور بھی باقی نہیں کہ نان ونفقہ کی تلاش میں وہ کم سنی ہی میں کسی کے عقد میں آجائے۔ مختلف پیشوں کا، تجارتوں کا، ملازمتوں کا دروازہ عورت کے لئے کُھل جانا اُس کی شہوانی زندگی پر نہایت درجہ موثر ہوا ہے۔

عورت کی "معاشی آزادی" اور شوہر کی محتاجی سے اس کی رہائی نے شادی کی ضرورت کو اس کے سامنے بہت ہلکا کر ہی دیا ہے، باقی یوں بھی اس میں ہر طرح خیر ہی خیر نہیں ہے اس کے اثرات جو پڑے ہیں اُنھوں نے اس کی شہوانیت کے حدود کو بہت ہی وسیع کر دیا ہے، اور اس کے لئے مواقع ایسے ایسے بہم پہنچا دیے ہیں، جو پہلے زمانہ میں سخت قابل ملامت سمجھے جاتے پھر جنسی مسائل کی تعلیم عام، خصوصاً منع حمل کے طریقوں کی اشاعت عام اور ان آلات کی فراہمی عام نے عورت کو شہوانی آوارگی اور بدچلنی کے نتائج کی طرف سے الگ بے فکر کر دیا ہے۔ کسی بن بیاہی کا باکرہ نہ ہونا پچھلے زمانہ میں تفضیح و رسوائی کا انتہائی مقام تھا۔ جنسی آزادی" کے دور میں وہ ایک معمولی بات بن گئی ہے۔ ان دونوں موثرات، یعنی ایک تو تدابیرِ منع حمل، دوسرے دوشیزگی کی بے وقعتی، نے مل ملا کر صورتِ حال یہ پیدا کر دی ہے کہ نوجوان عورتیں، تقریباً سب کی سب بدچلنی کے لئے بس موقع ہی کی منتظر رہنے لگی ہیں۔ اور سوسائٹی کے ہر طبقہ کی عورتوں میں شہوانی بدچلنیوں میں پڑنے کا شوق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

عورتوں کا بڑی اور روز افزوں تعداد میں ملازمتی اور کاروباری سلسلوں میں داخل ہونا بجائے خود سبب ہے آوارگی و بدچلنی کا پچھلے زمانہ کی الگ تھلگ رہنے والیوں کو مردوں کے ساتھ اس آزادانہ اور بے تکلف اختلاط کے مواقع ہی اول تو کہاں حاصل تھے، اور پھر اب تو لڑکیوں کے لئے ملازمت میں داخلہ اور عہدہ میں ترقی کی شرط ہی دوشیزگی کی نذر قرار پا گئی ہے۔ تھیٹر اور سینما کی زندگی میں تو یہ ہوا عام ہو ہی چکی ہے لیکن بعض اور دوسری ملازمتیں بھی بجز بیسوائی زیر نقاب کے اور کچھ نہیں۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جدید عورت کا لباس بجائے خود محرک نفس لباس ہے۔ کہنا یہ چاہئے کہ آج عورت کی دلکشی، زنانہ لباس ہی کی دلکشی ہے۔ لباس کا مقصد ہی غالباً تحریکِ جذبات تھا اور یہ مقصد اب صدیوں کے بعد پوری طرح حاصل ہو چکا ہے۔ خوش لباسی کے جادو کا حال کوئی بیسواؤں کے دل سے پوچھے اور

پھر جدید ایکٹرسوں سے یہی فن سوسائٹی کی حسین و جمیل خاتونوں نے بھی ہر زمانہ میں سیکھے رکھا ہے، اور اب اس فن کے رموز و اسرار تقریباً ساری زنانی آبادی میں عام ہو گئے ہیں اب شریف گھرانوں کی عورتیں اور اہل حرفہ کی عورتیں سب اس باب میں پیشہ ور بیسواؤں کی حریف و مقابل ٹھہر گئی ہیں، وہ رنگے ہوئے رخسارے وہ رنگے ہوئے ہونٹ وہ رنگے ہوئے ناخون، جو ابھی پچیس ہی سال ادھر آبرو باختہ بیسواؤں کے ساتھ مخصوص تھے، اب بڑی بڑی شریفوں اور شریف زادیوں کی علامتیں قرار پا چکی ہیں۔ غرض یہ کہ شریف زادیاں اپنی بے عصمتی کے عام کرنے میں اب بڑی سی بڑی بازاریوں سے بھی پیچھے نہیں ہیں۔

ادبیات کی طرف رُخ کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ افسانہ کی ہیروئن، اب وہ معصوم بھولی، پارسا لڑکی نہیں ہے، جو وکٹوریہ کے زمانہ تک تھی۔ اب وہ وہ ہے جو آوارگی سے خوب ذوق رکھتی ہے۔ وہ تلاش لطف میں نکلی ہے اور خوش وقتی کا حصول اس کا مقصد زندگی ہے۔ سینما کے پردہ پر جو بھی طلا فن، جو بھی زانیہ، دکھائی جاتی ہے، عملاً بیسوا ہی ہوتی ہے، سینما کی غایت ہی ایسی عورت کو اچھالنا ہے، جو لذت کی طلب میں، شہرت کی طلب میں، دولت کی طلب میں، اپنی عصمت کا سودا پوری بے حیائیوں کے ساتھ کرے۔

یہ ساری آزادیاں، یہ مردوں کے ساتھ اختلاط، یہ جدید رقص، ان سب نے مجموعاً و منفرداً عورت کے جذبۂ شہوانی میں وہ زبردست تحریک پیدا کر رکھی ہے، جس کی مثال بن بیاہیوں میں، پچھلے زمانہ میں تو ملتی نہیں۔ یہ ممکن کیسے ہے کہ آپ مردوں اور عورتوں کو ایسی صورتوں کے ساتھ اکٹھا کریں، کہ اگر فیشن کا زبردست حصار نہ قائم ہوتا تو یقیناً قانون فوجداری کی دفعات عائد ہو جاتیں اور پھر اس اجتماع کے باوجود دونوں جنسوں میں سوئے ہوئے فتنے بیدار نہ ہو جائیں۔ کوئی انسانی جبلت، شہوانی جبلت نہیں۔ وکٹوریہ کے عہد تک یہ محض تعلیم، تربیت، ماحول، ماں باپ کی نگرانی وغیرہ کا اثر تھا۔ جو لڑکیاں جنسی معاملات میں اس قدر بھولی بھالی رہتی تھیں، اور اپنے

شوہروں کے پاس پہلی رات گزارنے کے قبل جانتی بھی نہ تھیں، کہ زن وشو کی یکجائی میں ہوتا کیا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ لڑکیاں ابھی اسکول بھی نہیں چھوڑتے پاتیں کہ جنس اور عشق سب سے واقف ہو جاتی ہیں۔ کالج کی لڑکیاں تو کہنا چاہئے کہ سب ہی، اور اسکول کی لڑکیوں کی اکثریت، اگر پورے عمل زوجیت سے نہیں تو اس کے بیشتر حصہ سے تو واقف ہی ہوتی ہیں۔

اور یہ نہ ہو تو ہو کیا۔ کنواری لڑکی کو جب جنسی معاملات میں معلومات اتنی حاصل ہو جائیں کہ اس کی نانی، دادی بھی حیران رہ جائیں، اور جوش وشوق اتنا پیدا ہو جائے جو پہلے صرف خوش نصیب شادی شدہ بیویوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی اطمینان ہو کہ گزر بسر کے لئے کسی مرد کا دامن پکڑنے کی ضرورت نہیں تو شادی کی اہمیت تو روز بروز گھٹ ہی جانی چاہئے اور کم از کم اس کی عجلت تو رہنی ہی نہ چاہئے، شوق پورا موجود، جوش پورا موجود، اب آخر کیوں شوق کو پورا کرنے کے لئے تیس سال کی عمر کا انتظار کیا جائے؟ کیوں نہ اس دوشیزگی سے فوراً دست برداری اختیار کر لی جائے جس کی اب کہیں قدر وپرسش نہیں؟ اور کیوں نہ لطف اندوزی ولذت گیری کے سارے مقامات طے کر لئے جائیں؟ آخر وہ کیوں اور کب تک اپنا دل مارے رہے؟ وہ کیوں نہ سارے مزے لوٹے، جو بقول ناولوں کے، بقول ڈراما کے، بقول سینما کے، ساری دنیا لوٹ رہی ہے، جنس مقابل کے ساتھ یا اپنی ہی جنس کے ساتھ کیوں نہ بالآخر تجربہ کرکے، وہ اپنے مسئلے آپ حل کر لے؟

[پروفیسر مورنسن کے مقالہ کے صرف ایک حصہ کا یہ ملخص درج کیا گیا ہے اصل مقالہ اس سے کہیں زیادہ مفصل اور مطول ہے]

پھر جدید ایکٹرسوں سے یہی فن سوسائٹی
رکھا ہے، اور اب اس فن کے رموز
اب شریف گھرانوں کی عورتیں
جیسواؤں کی حریف و مقابل
وہ رنگے ہوئے
تھے، ا

…ق وفسق آسمان پر

[ہندو علم الاصنام کا ایک باب اسٹیٹسمن مورخہ ۱۰؍ستمبر ۱۹۴۱ء کا ایک مقالہ جو اُردو میں اپنا لیا گیا تھا]

آسمان کے چمکدار تارے، سب کے سب دیوتا اور دیوتا زادے مدرسہ میں زیر تعلیم تھے، درسگاہ کے صدر ناظم برہسپتی تھے۔ علم و فضل، حکمت و دانائی میں سارے دیوتاؤں کے سردار، آکاش کے کل دیوتاؤں کی گردنیں اُن کے آگے جھکی ہوئی تھیں وہ سب کے گرو تھے، سب اُن کے چیلے۔ اُن کا احترام و تقدّس سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے۔

شاگردوں میں سب سے بڑھ کر حسین و طرحدار چندرما (چاند دیوتا) تھا ان کی پیدائش کا طریقہ دنیا بھر سے انوکھا تھا۔ ان کے باپ برہمچاری تھے یعنی عورت سے علیحدہ رہنے والے۔ دل میں اولاد کی تمنا شدید پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی طبیعت کا یہ بھی تقاضا کہ تجرد میں فرق نہ پڑے اور عمر بھر کی ریاضت رائگاں نہ جائے۔ دعا قبول ہوئی۔ داہنی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور اس نے لڑکے کی شکل اختیار کرلی، بے ماں کا بچہ نازوں میں پلا، دلاروں میں بڑھا۔ کوئی روک نہ ٹوک، برہسپتی خود اسکول میں جنہیں سو نیکے کھلوتے دیکر بہلایا کرتے۔ پھسلایا کرتے

بچپن ختم ہوا۔ نوجوانی شروع ہوئی ایک روز دریچہ سے نگاہ اسکول کا باہر باغ کے ایک گوشہ میں گئی۔ گویا ایک سیاہ بادل کا ٹکڑا مست اور پُر کیف گھٹا۔ اِس پر

جابجا قطرے چمکتے ہوئے، گویا سیاہ مخمل پر موتی جڑے۔ ابھی نہ تھیں، کہ زن و شو کی یکجائی میں اور زیادہ غور! ـــــ ارے توبہ! کیسا بادل اور کہاں سکول بھی نہیں چھوڑنے پائیں کہ ادھر پشت کیے، نہا دھو کر سر کے بال سکھا رہی ہے! کہاں تو کہنا چاہیے کہ سب کے دل میں جذبات کا طوفان برپا ہو گیا۔ جس کے سر کی پـ ـسے نہیں تو اس چہرہ کے حسن کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا جمال کیسا بے پناہ ہوگا؟

لیجیے تارا نے منہ ادھر پھیرا (تارا منڈل اسی سے نکلا ہے) حسن وا تنی خود اس پر نازاں۔ تابش جمال نے نگاہ خیرہ کر دی! ـــــ تارا، چندرما کے آغو شوق سے رہ کر کہاں رہ سکتی تھی؟ اور کون اُسے دور رکھ سکتا تھا؟ ـــــ لیکن نہیں، تارا کوئی ناکتخدا چھوکری نہیں، وہ شادی شدہ خاتون ہے۔ برہسپتی کی بیوی! چندرما کے مقدس گرو کی حرم محترم سن میں کم سہی لیکن رشتہ میں چندرماں سے بہت بڑی تھی۔

ہوا کرے عشق کب اُن رکاوٹوں کا قائل رہا ہے اور عشق بھی جب دیوتا کے دل میں موجزن ہو! ـــــ دن گزرے، وقت گزرا۔ آخر ایک روز رات کے وقت اپنے خفتہ بخت شوہر کو سوتا چھوڑ، تارا نکل کھڑی ہوئی۔ دروازہ پر چندرما منتظر۔ دونو ہوا ہو گئے۔ ساری فضائے آسمانی کو طے کرتے ایک دور بہت دور کے ستارے میں پہنچے۔ وہیں اس محبوبہ کے لئے محل تیار ہو چکا تھا، ہر طرح کے سامان عیش سے لیس۔

دیوتاؤں کی دنیا میں چرچا پھیلا۔ دیویاں حیران، دیوتا انگشت بدنداں! اس بستی میں آج تک یہ اندھیر نہیں ہوا تھا۔ چیلا اپنے مقدس گرو کی ناموس محترم کو لے اڑے یا فضائے نور پر اندھیرا چھا گیا! برہسپتی خود بھی اپنی بیوی کا عاشق زار تھا فلسفیانہ متانت کے بعد چندرما کے پاس پہنچا اور بولا "تیری حرکت جتنی جا بیجا سہی، میں تجھ سے انتقام نہیں لیتا۔ تو آخر میرا چیلا ہے صرف اتنا سوال ہے کہ میری چیز مجھے واپس کر دے"! عاشق کے دل میں اتنی گنجائش کہاں تھی؟ پھر قوت کا زعم مستزاد، آسمانی

ہستیوں میں کس کی اتنی مجال ہے کہ مجھ سے میری محبوبہ کو جدا کر سکے! گرو جی دھتکار کر واپس کر دیے گئے۔ برہسپتی جی اپنے آشرم کو واپس آئے۔ اور اب دماغ انتقام کی تدبیروں پر لڑانے لگا۔ استغاثہ اندر کے دربار میں چل کر کرنا چاہئے۔ بارش اور ابر کا دیوتا، وہی سب سے پُر قوت ہے۔ اُس میں اتنی قدرت ہے کہ چندرما کے غرور کو شکست دے سکے اور چندرما سے اُس سے پُرانی چشمک بھی تو ہے، یہ چشمک اِس وقت خوب کام آئے گی۔

فکر اور عمل کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ اِندر دیوتا نے فریاد سنی، اور چندرما کے نام فرمان بھیجا کہ حق حقدار کو واپس کر دے۔ جواب انکار سے ملا۔ فرمان رد کر دیا گیا اور اب لڑائی کی ٹھن گئی ــــــ اِندر دیوتا کا جاہ و جلال بالکل ظاہر تھا۔ اُس کا اقتدار سب سے اعلیٰ تھا پھر مطالبہ بھی اُس کا تمامتر حق پر تھا۔ لیکن اُدھر چندرما بھی اکیلا نہ تھا۔ زحل و مریخ اس کے داہنے بائیں بازو تھے اور تاروں کی جتنی دیویاں ہیں، سب کا جھرمٹ اُس کے جلو میں۔ آخر تارا دیوی ان سب کی ملکہ تھی نہ! دیوتا بھی سب ہمیشہ دیوتا ہی تھوڑے ہی تھے، بہت سے انسان رہ چکے تھے، اور ریاضتوں کے بعد دیوتاؤں کی صف میں شامل ہوئے تھے اور جب بشر کے قالب میں تھے، بشری جذبات کے کھیل خوب کھیل چکے تھے ــــــ پہاڑ پہاڑ سے ٹکرائے، زمین تھرائی آسمان لرزا۔

لڑائی نہ اب ختم ہوتی ہے نہ جب۔ رب الارباب کو غصہ آیا کہ حق و انصاف کی فتح میں اتنی تاخیر! لشکریوں کی جانیں کیوں جائیں، تنہا چندرما اصل مجرم ہی کا فیصلہ دست بدست لڑائی سے نہ کر دیا جائے! شیو جی (موت و ہلاکت کے خدا) نے اپنا سب سے زیادہ مہلک حربہ برہمتر پھینک کر مارا۔ چندرما نے اس کا جواب اُسی درجہ کے حربہ سومستر سے دیا! ــــــ کائنات کی بنیادیں ہل گئیں!

برہما جی (خالق کائنات) اب اپنے مراقبہ سے چونکے، گھبرائے غضب ہو گیا! یہ تو میری ساری محنت ہی پر پانی پھرا جا رہا ہے! میرا کیا کرایا برباد ہوا جا رہا ہے۔

ہیری پیدا کی ہوئی خلقت فنا ہوئی جا رہی ہے! اور یہ چندرما ہے میرا پوتا تو کیا ہوا' بڑا ناہنجار نکلا- پہلے اپنے گرو جی پر ہاتھ صاف کیا- پھر ڈھٹائی کے ساتھ اپنے سے، بڑوں کے مقابلہ پر نکلا' اور اب میرے برابر کے دیوتا' میرے شریک و سہیم شیو جی سے ٹکر لے رہا ہے! او ناشدنی! تجھے شرم نہیں آتی- اپنے دادا کے مقابلہ میں صف آرا ہو رہا ہے! بس اب تیری خیر اسی میں ہے کہ اپنے گرو کی چیز اُسے واپس دیدے، جان تیری اسی طرح بچ سکتی ہے- باقی اب تک جو تو جرائم کر چکا ہے' اُس کی سزا یہ ہے کہ آج سے ہر پندرہویں دن چہرہ کی روسیاہی تیرے نصیب میں رہا کریگی!

لڑائی ختم ہو گئی- اور ختم یوں ہی ہونی تھی- چندرما کا دل اب تارا سے اُکتا چکا تھا- عاشقی کے جذبات فنا ہو چکے تھے- بیوی شوہر کے پاس واپس آئی' اور چند ہی روز بعد ایک لڑکا جنی' زرد لباس میں ملبوس' انسان کی شکل کا خوب گورا چٹا مضبوط اتنا کہ کسی کے مقابلہ میں مغلوب ہونا جانتا ہی نہیں- صورت بالکل چندرما سے ملتی ہوئی- ولدیت اُسی کی تسلیم ہوئی- ماں جواب دیتے ہوئے شرمائی' لجائی ------ لڑکے کا نام باپ نے بُدھ رکھا- زمین پر ایک سلطنت اُسے حکومت کے لئے عطا ہوئی- قوت تسخیر کا یہ عالم کہ ہاتھی اس طرح پیچھے پیچھے پھرتے' گویا کوئی کتا دُم ہلاتا ساتھ ساتھ ہے! ------

دیوتاؤں نے کہا کہ بیا بیا عراقی تو ازاں خاص مائی!

یہ تو ہم میں شامل ہونے کے قابل ہے' اسے زمین سے آسمان پر اٹھا لو- برہما جی نے حکم دیا' کہ آج سے اس کا شمار بھی آسمان کے دیوتاؤں میں ہو- عطارد ستارہ کو آپ پہچانتے ہیں؟ یہ وہی ماہتاب زادہ ہے!

خود چندرما جی بھی اپنے گرو کی بددعا کے اثر سے نہ بچے' دق کا مرض مسلط ہو گیا گنگا مائی کے کنارے آ' ہردوار کے قریب' ریاضتیں کرنی شروع کیں- مہادیو جی اس کفارہ سے راضی ہو گئے' حکم ہوا' بیماری دور ------ گنگا جی کے کنارے رشی کیش میں چندریشر کا جو متبرک مندر ہے' یہ تیرتھ اسی مقدس واقعہ کی یادگار ہے!

ایک بزمِ مشاعرہ
(کی)
غیر شاعرانہ صدارت

(لکھنؤ دفتر حق و صدق میں ۶ و ۷۔ مارچ کی درمیانی شب میں ایک محفل مشاعرہ، شوکت تھانوی صاحب ایڈیٹر رسالہ کائنات اور ملک کے مشہور مزاحیہ نگار کی دعوت پر منعقد ہوئی۔ صدر محفل ایک نااہل کو بناکر بٹھا دیا گیا۔ اُس نے اپنی بے کمائی کا مظاہرہ الفاظ ذیل میں کیا)

بزم مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اُس کا صدر ایک دیہاتی! اور دیہاتی بھی کیسا زبان و ادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب میں محض غبی با داد بانیٔ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجئے۔ سبحان اللہ! کیا خوب نظر انتخاب پڑی ہے! ان کی علمی ظرافت سب پر روشن و آشکار۔ لیکن حقیقت آج کی عملی ظرافت اس کا شاہ کار، دنیا کی نظر میں وہ محض ایک ظریف، لیکن آج کے صدر مشاعرہ کے حق میں ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہے، قحط الرجال بلکہ نیرنگی دہر کا ایک کھلا ہوا نشان اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانہ کا گمان! بلکہ یوں کہئے کہ فسانہ عجائب کا کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحب "کائنات" کی سرپرستی میں زیر طبع ہو تو اس کے لئے موزوں عنوان!

صدر اور صدارت کا نام آتے ہی ذہن منتقل ہوتا ہے "خطبۂ صدارت" کی جانب بلحاظ ضخامت طویل و عریض، بلحاظ ادب و انشا فصیح و بلیغ و بلحاظ معانی و مطالب عمیق، اور بلحاظ تحقیق فن دقیق۔ سامعین مطمئن رہیں کہ اس قسم کی بحر طویل میں کوئی غزل اُن کی خدمت میں پیش کی جائے گی اور نہ دو چار منٹ سے زائد انہیں تکلیف دی جائے گی،

نہ شاعری کی اہمیت پر ہومر اور کالیداس کے حوالوں سے کوئی محققانہ تبصرہ' اور نہ اردو شاعری کا ولی دکھنی کے وقت سے شروع کر کے کوئی ناقدانہ تذکرہ! یہ مختصر سی سامعہ خراشی جو کیجا رہی ہے' وہ بھی محض اس ارشاد کی تعمیل میں' کہ خطبۂ صدارت کے نام سے کچھ نہ کچھ ہو ضرور —— گویا یہ بھی کوئی فرض ہے کہ بلبلوں کی نوا سنجیوں سے قبل کچھ دیر زنات وشوق نوائے سے بھی لطف اٹھالیا جائے۔

یاران بزم! محفل مشاعرہ اور تقویم مسیحی کی بیسویں صدی! اردو شاعری کی پرانی دُھرانی بزم! اس ترقی وتجدد کے زمانہ میں! یہ وقت ہے سینما کا' تھیٹر کا' اوپرا ہاؤس کا' گراموفون کا' ریڈیو کا' ٹاکیز کا' میوزک ہال کا' کارنیوال کا' یا آپ کے فن عروض کا' قصائد حمد ونعت کا' منقبت کا' مناجات کا! آپ کے مشاعرہ غریب کی پرسش آج ہے کس دربار میں؟ آپ کے شاعروں کے لئے عزت کی کرسی اس وقت ہے کس سرکار میں؟

مشرق کے خلاف جو بغاوت خود مشرق سے کرائی گئی ہے اور آپ کے گھر میں جو آگ گھروالوں کے ہاتھ سے بھڑکائی گئی' وہ ناتمام اور ادھوری رہ جاتی۔ اگر اس کا رُخ مشرقی شاعری کے بھی خلاف نہ ہوتا۔ آپ باغی بنائے گئے۔ اپنے آباواجداد سے' اپنی تہذیب ومعاشرت سے اپنی وضع ولباس سے اپنے علوم وفنون سے' اپنے دین و اخلاق سے' اور اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو اور کسی شعبۂ زندگی سے گھٹ کر بھی نہیں اپنے شعروادب سے! آپ کی شاعری فرنگیت کے پیمانہ سے نپنے لگی۔ اسی میزان میں تُلنے لگی' اور فیصلہ یہ صادر ہوگیا کہ اردو شاعری میں رکھا کیا ہے؟ بجز ہزل اور تخریب اخلاق کے اس میں ہے کیا؟ —— گویا بائرن انگریزی کا نہیں اردو کا شاعر ہوا ہے اور شکسپیر نے "لکریشیا" فرنگستان میں نہیں' دہلی یا لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھی ہے۔

مکالے' اور مکالے کے بعد آنے والوں نے ہمارے ادب سے متعلق جو گہر افشانی کی ہے' کیا ہم اُسے بھول گئے ہیں؟ اور آہ کہ ان بیگانوں کے ساتھ اپنوں کی بھی زبانیں جس طرح اپنی زبان' اپنے ادب' اپنی شاعری پر کھلی ہیں اُسے ہم بھلانا چاہیں بھی تو کیونکر

بھلا سکتے ہیں؟

آج جبکہ نہ دلّی کی سرکار ہے، نہ اودھ کا دربار، اور شاعروں کی قدر اتنی بھی نہیں جتنی ناٹک کے گویوں اور سینما کے بھانڈوں کی ہے، آفریں ہے آپ کی ہمت پر جو اب بھی آپ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی یاد کو سینہ سے لگائے، کلیجہ سے چمٹائے ہوئے ہیں، اور بجلی کے قمقموں کے دَور میں اپنی شمع کافوری جلائے ہوئے ہیں!

حقائق و معارف کی ترجمانی، ہر ہر دور میں فارسی شاعروں اور اردو شاعروں سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ شاعروں سے مراد جماعت کے حقیقی باکمال افراد ہیں، ورنہ ننگ جماعت افراد کس طبقہ میں نہیں ہوتے؟ کون ایسا چمن ہے جس میں گل، بغیر خار کے ہوں؟ آپ کے فخر کے لئے آپ کے بلند پایہ اسلاف معنوی کے کارنامے کافی ہیں، بلکہ کافی سے بڑھ کر۔ وانی کوشش کیجئے کہ ہر قدم انہیں کے نقش قدم پر پڑے، تاکہ ممکن ہو تو حقیقت سنجی میں، حقیقت بینی میں، حقیقت گوئی میں، ان سے آگے بڑھ کر رہے۔ اور اوراق لیل و نہار پر اپنی یہ تاریخ ثبت کرا جائیے کہ آپ کے ہاں فیضی اور عرفی اس وقت بھی برابر پیدا ہوتے رہے، جب دربار اکبری مدت ہوئی برخاست ہو چکا تھا!

غالبؔ کا فلسفہ

[لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشریہ - ۱۶ر فروری ۴۲ء کو غالب کی برسی کے موقع پر]

فلسفہ کے نام سے گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے ناماموس لغات کا، ثقیل، مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خود شناسی کا۔ زینہ ہے خدا شناسی کا۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے گرد وپیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات واطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں، جن سے ہم کو آپ کو سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے کبھی جان کر، اور کبھی انجان۔ انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو گئے پھر غالبؔ غریب، کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں۔ ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں، عمق کی عادی۔ چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر۔ سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں، اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے، تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلآویز نظم میں، کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی بہ زیادہ ہو گئی، ورنہ تحقیق کی زبان سے تو روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم ونثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے،

نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت، کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا، جب چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا۔ مُرجھائے دِلوں کو کھلا دیا! فطرت بشری کے رازدار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سُروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہی اُن کی حکمت، یہی اُن کا فلسفہ۔ یہی اُن کی شاعری کا پیام، یہی اُن کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے اور دماغ بیدار۔ شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے، جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا۔ جوں جوں سِن بڑھتا گیا، پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و سرمستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں، لیکن اس بیہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ رفتارِ نفس بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی، لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدّت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا نیا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا طباق سا چاند ہوتا ہے، وہ آخر پیدا ہوتا ہے اُسی سَنْخی، کم رو، اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے۔ گویا کمال کی بنیاد، ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے۔

بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال غافلاں! نقصان سے پیدا ہے کمال

مذہب کے تعدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے، اور فریقانہ غلو سے تنگ آکر کہتے ہیں، کہ سکونِ خاطر منظور ہے، تو بس توحید سے لو لگا لیجیے،

وحدت کی خانقاہ میں کنج نشین ہو جائیے، اور یک داں، یک بیں، یک گو بن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بتخانہ کھینچیے جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے، تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے۔ اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دِیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لیے مانگ چوٹی اِن کی بھی درست کرتی ہے اُن کی بھی۔ اسی مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے، لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں اور باہر اُسی وقت نکالتے ہیں، جب چوٹ پڑ لیتی ہے، دل پر نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی، سلسلۂ موجودات میں جس کا جیسا ظرف ویسا ہی اُس کا مرتبہ ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بیشک بے حد و بیشمار۔ لیکن فطرت میں جو قدرتِ عصیاں، سیلانِ فسق، طاقت گناہ رکھ دی گئی ہے، وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گناہ کہاں تک کریگا، جتنے بھی کریگا، پھر بھی بہت سے چھوٹ ہی جائینگے، کر سکتا ہو گا، مگر کریگا نہیں۔ پھر کیا جب وقت جزائے کامل کا آئیگا، تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھیگی؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے۔ کہیں یوں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں بھی ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے ہم نے آپ نے سب نے دیکھا ہے چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا، اور اُس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت اس منظر پر بھی کبھی کبھی نظر پڑی ہوگی۔ غالبؔ کی نظر اس پر بھی گڑ گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے، نشو و نما بخشنا ہے، اور بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن اِدھر کرن پھوٹی، اُدھر شبنم کا وجود بھی رخصت ہوگیا کل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کرلیا۔ ظاہر میں فنا اور واقعۃً بقا حاصل ہوگئی، اور کہتے ہیں فلسفۂ وحدت وجود کے اندر گُم ہو کر کہتے ہیں، کہ یہی حال انسان کا ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اُس پر توجہ کرے۔ اُس پر تجلیِ رحمت کا عکس ڈالے، اور اُسے اپنے اندر جذب کرلے ——— بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے بمنزلۂ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور پھر یہی مضمون ایک دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا، یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کرائی محنت سب دَم بھر میں غارت گئی، اور جو غلّہ کا انبار تھا، وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ لیکن دہقان ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کرکے اس آفت کا محل تیار کیا تھا۔

اس آگ کے لیے مسالہ فراہم کیا تھا۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لے ہلکی ہے۔ دھیمے سُروں میں کہتے ہیں ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے۔ اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے، اس کاروبارِ حیات کی مثل طلسمات نمود ہے، حقیقۃً معدوم اور صرف بہ ظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا، بارکلے کے نام کا گزرا ہے، وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

ان کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر کبتک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی!

اور پھر کہتے ہیں، اور فلسفہ کی خشکی میں شاعری کی رنگینی پیدا کرکے کہتے ہیں ؎

شاہد ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربہ نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ جب تک کہ انسان اس، آب و گل کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے یہ جھگڑے بہرحال اس کا ساتھ چھوڑنے

کے نہیں۔ مرزا کی آپ بیتی اُن کی ذاتی نہیں، نوعِ بشر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن شعر کے موزوں سانچے میں، لطیف قالب میں ادا تو اُنھیں کی زبان سے ہو رہی ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم، ردیف و قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے، اُس کی بھی بساط کیا، اور پائداری کتنی! ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے بس رقصِ شرر ہونے تک!

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا بالکل علٰحدہ کر لیتے ہیں، اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں اور باپ، بھائی اور بہن، ہمسایہ اور ہموطن، کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالب کی اصطلاح میں اس کا نام "وحشت ہے" اور اُن کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے، نہ کہ دوسرے ؎

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکمائے اخلاق نے لکھا ہے۔ مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے۔ اور اس لیے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے۔

حسد سے دل ہے گر افسردہ، سرگرم تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مذہب: اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں، عارفوں کے نزدیک اِخلاص ہے۔ غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں۔ ان کی شریعتِ شعری کا فتویٰ ہے کہ وضعداری بجائے خود قابلِ صد قدر و مستحق ہزار داد ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہلِ باطن کا قول ہے کہ حکمت کاملہ کو منظور رہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں فلاں حدود کو توڑ دے، تو اب بندہ کا اُس سے جھجکنا اور رُکے رہنا خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سنیئے: ؎

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے　　کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش و موثر انداز میں ؎

کر رہا ہوں میں اُسے نامۂ اعمال میں نقل　　کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نا محدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں، اور جو مطلق ہے، اُسے کوئی مقیّد اپنی عقل و فہم کی گرفت میں کیسے لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی، بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے، اور ذرا دیکھیے گا کس شاعرانہ، بانکپن سے اُسے اپنے انداز میں دوہرایا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلیِ صفات سے کب تسلّی ہو سکتی ہے؟ غالب، صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سُجھائی ہوئی اس حقیقت کو دوہراتے ہیں، اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں، شاید اس لیے کہ شاید سننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالب، خانقاہ کے بوریہ پر نہیں، مشاعرہ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ سن بڑھتا گیا، اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا، سرتا سر مرصع۔ مدۃ العمر کے تجربات کا نچوڑ، سارے فلسفۂ حیات کا خلاصہ، روداد زندگانی کا لب لباب ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سُنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے۔ اس قطعہ کا زمانہ صاحبِ غالب نامہ کی تحقیق ہے، کہ سنہ ۱۸۲۷ء ہے، گویا غالب کی عمر اُس وقت کل ۳۰ سال کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط، عبرت اور فنا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں۔ ۱۹ جون سنہ ۱۸۶۳ء کو یعنی اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

"خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم"

منزلِ ویراں کی ویرانی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین چار سال قبل نومبر سنہ ۱۸۶۵ء میں تحریر کرتے ہیں:۔

"نمایش گاہِ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا۔ اب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہو کر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں "نجات کا طالب، غالب"، "مرگِ ناگاہ کا طالب، غالب"۔ اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:۔

"زندہ ہوں، مُردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار، غالب"

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے، اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جا رہے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالبؔ
دل کے خوش رکھنے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

اردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی، اور اُس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سُن لیا ہے۔ اب مقطع بھی سُن کر فاتحۂ خیر کے لیے ہاتھ اُٹھا دیجیے۔ حالیؔ کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

صوبہ کا مسلمان حکمراں

۱۴ اپریل کے سہ پہر کو آنکھوں نے جو موثر منظر دیکھا، وہ عرصہ تک بھولنے والا نہیں
مسجد دارالعلوم ندوہ کے سنگ بنیاد نصب کرنے کی تقریب تھی اور بنیاد
رکھنے والے نواب صاحب چھتاری تھے۔ جب ارکان ندوہ نے یہ طے کیا تھا،
اُس وقت نواب صاحب گورنر نہ تھے، اور نہ ارکان ندوہ کو ان کی گورنری کا خیال
تھا، جب تاریخ موعود آئی، تو اس درمیان میں نواب صاحب صوبہ کے گورنر مقرر
ہو چکے تھے، اور کئی دن ہوئے گورنری کا باضابطہ چارج بھی لے چکے تھے۔ ندوہ گورنمنٹ
سے "ایڈ" لے رہا ہے، اور دارالعلوم کا سنگ بنیاد بھی سر جان ہیوٹ (لفٹنٹ گورنر)
کا رکھا ہوا ہے، اس لیے مسجد ندوہ کا سنگ بنیاد اگر مسلمان گورنر رکھتے، تو خلافِ توقع
نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صوبہ کے گورنر سے نہ کوئی استدعا کی گئی، نہ
گفتگو ہوئی تھی، جو کچھ بھی طے ہوا تھا، وہ شخصاً نواب صاحب موصوف سے ہوا
تھا، اور یہ بالکل اتفاقی بات تھی، کہ وہ عین وقت پر صوبہ کے حکمراں بھی تھے۔
ٹھیک سوا پانچ پر آمد تھی۔ آگے آگے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی موٹر سائیکل،
پیچھے کچھ فاصلہ پر ہزاکسلنسی کا موٹر۔ ہم دس بارہ آدمی (ارکان انتظامیہ ندوہ)
برآمدہ میں استقبال کے لیے صف بستہ، موٹر رکا، آگے اور پیچھے انگریز پرائیوٹ
سکرٹری اور انگریز ایڈیکانگ۔ درمیان میں توقع تھی، اور توقع سے گزر کر یقین
تھا، کہ انگریز نہ سہی، انگریز نما، گورنر ہوگا ——— توقع پوری نہ ہوئی، اور

یقین باطل نکلا۔

نہ انگریزی ہیٹ، نہ انگریزی سوٹ۔ سر پر معمولی ترکی ٹوپی، جسم پر معمولی شیروانی، اور معمولی سفید پاجامہ! وضع میں، لباس میں، گفتار میں، رفتار میں، انگریزیت کا کہیں پرتو تک نہیں۔ سرتاپا مشرقیت اور اسلامی سادگی کا ایک پیکر! بلند و بالاقد، جمیل و روشن چہرہ، گویا ایک تُرک، ہندوستانی لباس میں! یہ کون تھا؟ ضلع کا کلکٹر نہیں، قسمت کا کمشنر نہیں، سارے صوبہ کا حکمراں، وہ جس کے آگے کلکٹر، کمشنر، جج، اور بڑے بڑے گردن کش، گردنیں خم کرنے پر مجبور! بصارت دنگ، بصیرت متحیر، کہ اس صدی میں اور یہ منظر! ذٰلك فضل الله یؤتیه من یشاء ــــــ یہ اُس دادا کا پوتا ہے، جو اپنا وطن، اپنا خانماں، اپنی ریاست، اپنی جائداد، سب چھوڑ چھاڑ، بیت اللہ کو ہجرت کرکے چلا گیا تھا، اور وہاں سے پھر وطن آیا، تو اپنے مرشد، اور اس دور کے مرشدِ کُل، حضرت حاجی امداد اللہؒ کے حکم سے، کہ ہندوستان جاکر یتیم پوتے کی پرورش کرے ــــــ وہی بیکس یتیم، جو آج صوبہ کی ۵ کروڑ مخلوق میں دینوی حیثیت سے سب سے زیادہ معزز و سربلند ہے!

جلسہ کا آغاز، کلام پاک کی تلاوت، قاری خوش الحان، اور رکوع بھی کونسا، واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت و اسمٰعیل۔ اُس وقت کی یاد، اور اُس سماں کا تذکرہ، جب بے گھر اور بے مکان والے کا سب سے پہلا سب سے بڑا گھر، دنیا میں بن رہا تھا، جب سب سے پہلی اور سب سے بڑی مسجد تعمیر ہو رہی تھی، اور اُس گھر کے مزدور کون تھے، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ، پتھر پر پتھر ڈھوتے جاتے تھے، اور خدا جانے، خشیت کی کن کن کیفیات سے تڑپ تڑپ کر، کس کس طرح رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر، دعائیں بھی مانگتے جاتے تھے، کہ ربنا تقبل منا، انك انت السمیع العلیم۔ حضور والا، یہ ہماری حقیر نذر قبول بھی فرمالیں، کہ آپ ہماری زبان سے نکلی ہوئی التجائیں بھی سُن رہے ہیں، اور ہمارے دلوں کی حالت بھی آپ پر خوب روشن ہے! ــــــ اہل دل ہی سے

کون تھا، جو یہ منظر یاد کر کے بھی دل پر قابو رکھ سکتا؟

اور قاری سے متصل، بندوں کی طرح سر جھکائے، اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے، کھڑا کون تھا؟ یو۔پی کا گورنر، ۴ کروڑ ۹۶ لاکھ انسانوں کی قسمت کا مجازی مالک، اُس لق و دق صوبہ کا حکمراں، جو آبادی میں اٹلی سے، فرانس سے، اور خود برطانیہ سے بھی بڑا ہے! وہ احمد سعید خاں جس کے سینہ میں خود بھی قرآن محفوظ ہے، جس نے دس سال کی عمر سے، آج تک شاید کسی رمضان میں بھی قرآن سنانا ناغہ نہیں کیا، جس نے منسٹر ہو کر قرآن سنایا، ہوم ممبر رہ کر قرآن سنایا، اور جو راونڈ ٹیبل کانفرنس کو چھوڑ، لندن سے ہندوستان چلا آیا، کہ قرآن سنانے کے معمول میں فرق نہ آئے! ——— اہل تن میں سے کون تھا، جو اس منظر سے غیر متاثر رہتا؟

ایڈرس پڑھ کر سنایا گیا۔ اس معمولی رسم کے اندر چھپی ہوئی، لیکن چھپی ہوئی غیر معمولی حقیقت یہ بھی تھی، کہ

"تعمیر مسجد کے ثواب کی عظمت اظہر من الشمس ہے، من بنیٰ لِلّٰہ مسجداً بنی اللّٰہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ ...... ہم بصد خشوع دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور اُن تمام بزرگوں کو جنھوں نے اس کارِ خیر میں اعانت فرمائی ہے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے"

کسی گورنر کو آج تک اپنے ہاں بُلا کر، حدیث رسول سُنائی گئی ہے! کس کی قسمت میں عالموں کی زبان سے مرضیات الٰہی پر چلنے کی دعا سننے میں آئی ہے؟

جواب اڈریس میں لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی کے چانسلر، اور مسلم یونیورسٹی کے رکٹر کی زبان سے یہ الفاظ، خدا جانے کتنی روحوں میں تازگی اور بالیدگی، اور کتنے قالبوں میں افسردگی اور پژمردگی کا سبب بنے ہونگے:۔

"ایک ایسی علمی درسگاہ میں جیسا کہ آپ کا ندوۃ العلماء ہے،

طلبہ کی ذہنی اور دماغی بالیدگی کے ذرائع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ
اُن کی روحانی نشوونما کا سامان بھی مہیا کرنے کی سخت ضرورت ہے،
اور کون انکار کرسکتا ہے کہ اُس عبادت گاہ کے سوا جس کا سنگِ بنیاد
نصب کرنے کے لیے آپ نے مجھے یہاں طلب فرمایا ہے، کوئی اور
دوسری چیز ہوسکتی ہے، جو اس خیال کو تکمیل کے ساتھ پورا کرے۔"

عین بنیاد رکھنے کے موقع پر صرف ارکانِ انتظامیہ، مع گورنر کے اسٹاف کے دو انگریزوں کے موجود تھے۔ نماز عصر کا اوسط وقت تھا۔ آفتاب کی تابش مدھم پڑ چلی تھی۔ پتھر نصب کرچکنے کے معاً بعد، دنیا کے اسی بڑے حاکم کی زبان، احکم الحاکمین کے حضور میں کھلی، اور قبلہ رُخ ہوکر، ذیل کے مختصر بول، بغیر کسی تیاری اور تمہید کے، تصنع سے پاک اور تکلف سے بَری، حلق سے نکل، فضا میں گونجے:۔

"اے پروردگار، یہ پتھر تیرے گھر کا تیرے ایک گنہگار بندہ نے
رکھا ہے، اس کے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت سے مسلمانوں کو
توفیق عطا کر کہ اس گھر کو آباد رکھیں، تیری عبادت کریں، اور
تیرے رسول کے احکام پر چلیں۔"

گورنر کی زبان کا ایک ایک لفظ پہلے سے مرتب کیے ہوئے پروگرام کا پابند ہوتا ہے، اس دو لفظی تقریر کا پروگرام میں کہیں ذکر نہ تھا۔ سننے والوں کے دل اثر میں ڈوب کر رہ گئے، کہنے والے نے کہا کس دل سے ہوگا!

جلسہ میں میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ وقت وہ تھا، جب پروگرام کے خلاف، اور مجلس انتظامیہ کے علم میں لائے بغیر، ایک طویل اردو نظم سنائی گئی، جس کے ہر ہر شعر میں "گورنری" کی مبارکباد، اسی رسمی ایشیائی مبالغہ کے انداز میں تھی۔ اس قصیدہ تہنیت کا یہ کوئی محل نہ تھا۔ اور پھر واقعیت بھی ایک ایک شعر کے نیچے ذبح ہو رہی تھی۔ مبارکباد ممدوح کو دی جا رہی تھی کہ اُسے یہ منصبِ جلیل ملا۔ حالانکہ مبارکباد کے قابل خود منصبِ گورنری تھا۔ سرافرازی حقیقتہً

نواب ممدوح کی نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ ہاؤس کی ہوئی۔ گورنمنٹ ہاؤس نے آج تک بجز لحم خنزیر کے لوتھڑوں اور شراب کی بوتلوں کے اور دیکھا کیا تھا۔ سوا ناچ اور رنگ کے غفلت کے قہقہوں اور انانیت کی بدمستیوں کے اور جانا کیا تھا؟ آج پہلی بار ہے کہ اس کے در و دیوار قرآن کی آواز سُن رہے ہیں۔ آج پہلا اتفاق ہے کہ اس کے ہال اور برآمدے اذان اور تکبیر سے گونجے ہیں۔ آج کا دن اُس کی تاریخ میں، اُس کی عمر میں پہلا دن ہے کہ اس کی زمین نے کسی کو اللہ کے آگے جھکتے اور گرتے، ہاتھ باندھتے اور سر جھکاتے دیکھا ہے! پردہ کے لیے قناتیں کھڑی ہونا، خلیل اللہ کی سنت کی اتباع میں قربانی کا خون گرنا، آج سے قبل کیا اُس کے نصیب میں آیا تھا! سربلندیاں مکین کو حاصل ہوئیں یا مکان کو!

آج عمر بن عبد العزیزؒ کیا معنی، اورنگ زیب عالمگیرؒ کا بھی زمانہ نہیں، آج تو وہ وقت ہے کہ "صاحب" کی عدالت کے چپراسی اور پیادے تک اسلام پر مضحکہ کرنے کو تیار ہیں۔ دین کی اس بے بسی کی گھڑی میں، یا جوجیت کے اس نزغے میں، مبارک ہے وہ جو اتنے بڑے مرتبہ پر پہنچ کر بھی اپنے کو نہ بھولا، اپنے مالک و مولا کو نہ بھولا، اپنے کو بندہ سمجھا، جب تک جیا، اپنی بندگی ہی پر فخر کرتا رہا، اور جب وہ وقت آئیگا، جس سے مفر نہ گورنروں کو ہے نہ وائسراؤں کو، نہ بادشاہوں کو، نہ شہنشاہوں کو، تو انشاء اللہ اپنے اللہ ہی کی گواہی دیتا ہوا اپنی بندگی ہی کا اقرار کرتا ہوا، اپنے رسول کا کلمہ پڑھتا ہوا، قرآن کی دولت کو اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے وہ رخصت ہوگا!

محمد علیؒ

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی، کہ یہ شب، شبِ قیامت یا نمونۂ شب قیامت، بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزار تے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ ابکی اسی رات کو ان کا نصیبہ سُلادیا جائیگا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اُسی وقت اُسے اُٹھا لیا جائیگا، جس کے وجود سے ملّت اسلامیہ کا وجود تھا جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت، اللہ کا نام جینے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے! اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اُٹھا لیے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لُٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اُڑی، مصر کا سردار اُٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم، ہر زخم کے لیے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اسی خیال سے، کہ جو کچھ بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے، آہ، کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شبِ مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چِھن گیا، اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لیے یہ منادی کردی

تھی کہ وما محمدٌ الّا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افاِن مات او قُتل انقلبتم علٰی اعقابکم، اُس کے فرشتوں نے، اُس کے بندوں تک، محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچادی!

اے پاک پروردگار، اے سب کے چلانے والے اور سب کے اُٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ، آن کی آن میں، ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم، بنا دینے پر قادر، لیکن کیا ہم جیسے ناتوان وکمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمایش، اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمایشیں تو ابرار وکاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لایق تھے، کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل وکرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں، عین اُسی وقت، ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا، جس کی موت کی خبر بھی نہ سننی پڑے، اُسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور اُس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جا سکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر، کہ تیرے حبیبؐ ومحبوبؐ کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لا سکا، تو تیرے اُس حبیب پاکؐ کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان ونابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمایش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اِس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمایش کے لیے دل وجگر کس سے مانگ کر لائیں!

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں، کہ ایک بڑا قومی لیڈر اُٹھ گیا، نیشنل کانگرس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہو گیا، یہ سب کچھ صحیح ہو گا، لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا، کہ اللہ کا بندہ اُٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشقِ زار رخصت ہو گیا! آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر، اور بہترین انشا پرداز گم ہو گیا، ماتم اس کا ہے، کہ وہ گم ہو گیا، جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا، جس نے اپنی دنیا برباد کر کے، اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا، جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اُتار کر، جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، اگر دُھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لحظہ و ہر آن اگر تڑپ تھی، تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اُس کی سچی آپ بیتی خود اُسی کے ایک شعر میں سنیے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولتِ دُنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے!

بیشک، اُس نے دنیا، اور دولتِ دُنیا، ساری کی ساری کھو کے رکھ دی، اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لُٹتے" ہوئے سب نے دیکھا، "پاتے" ہوئے اور "لیتے" ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی، اور "کل"، انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصّہ میں آئی۔ علیگڈھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی یہ "سول سروس" کی جانب لپکے، اُلٹے پانوں واپس کیے گئے، بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعائیں، جو غلافِ کعبہ کو پکڑ کر ربِ کعبہ سے مانگی

گئی تھی، کہ "میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنا دے" ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف "مسٹر" تھا، بلکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر داڑھی، سر پر پتے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن، اور دل کے اندر اسلام کا سوز، اور دین کی تڑپ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، "کامریڈ" و "ہمدرد" کے بلند ترین معیار کا قایل ہر ایک متنفس، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظربندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اُٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بھی بڑھ کر آزمائش، کہ عمر بھر کے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، "بنگالی ٹولہ" سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلِ حدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ، مدت سے تھی ہی، اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود، اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لیے، ساری خدائی سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آ جاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہنچ چکی تھی، کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے!

اُسے کوئی کیا سمجھاتا، اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر، اللہ کے لیے، سب سے لڑا، اور خوب لڑا۔ شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا، اور بالکل سچ کہا کرتا تھا، کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے، تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے، کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے، کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنانا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دلشکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے۔ کوئی کہتا، کہ آخر ساری دُنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، کمریڈ و ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور و غل میں پڑکر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضایع کیا۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا، کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی! اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی "دیوانہ" ہو چکا تھا۔ اُسے جو کچھ دکھایا گیا تھا، اُس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا، تو اُس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعس رادید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، کہ محمد علی کو نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے، وہ "دیوانہ"، عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اُس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا، جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے، نہ "کمیونلزم" وہاں تو نظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے، کہ جو اتنا اونچا ہو چکا، اُسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے، اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اُس کے لیے باعثِ فخر یہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بُت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی، بہت بڑا ہندوستانی تھا، اُسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اُس کی ہندوستانیت ماتحت تھی اُس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دو کا قایل نہ تھا، قایل صرف "خدا" کا تھا، اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض رکھی ہے، اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے کی گئی ہیں، اور جب وہ اُمیدیں

اُن پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں، تو ناپاکوں نے اُن پر حملے بھی خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آرہی ہے۔ قالوا یاصالح قد کُنتَ فینا مرجوًّا قبل ھذا اتنھانا ان نعبد مایعبدُ اباؤنا وانّنا لفی شکٍّ مما تدعونا الیہ مُریب۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے، کہ جس نے ذرا سا بھی دعوئ محبت کا کیا، اُس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ دنیا ہی میں بیٹھے ہوے جنت کی فضا دیکھ

اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبّوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لیے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلّت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکستِ نفس!

عشقِ معشوقاں نہان ست و ستیر عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ عشق عاشق جانِ او را سوختہ!

محمد علی، تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مُردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجاے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے، اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے والذین آمنوا باللہِ و رسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم و نورھم۔ تو اِس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لیے ہوئے، عالم برزخ میں جنت کی

سیر کر رہا ہے، اور تیرے نیازمندوں کو اپنی جگہ پر یہ یقین ہے، کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جمِ غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کریگا۔ اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا۔ جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکیگا، اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاءاللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیقِ خاص، غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ و ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے،

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے!
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم، تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی و وارث چل بسا، تیرا سہاگ لُٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خفتہ بخت ملت آج تو یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایہ پدری اُٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست، ہر ناممکن کو ممکن، کر دکھا سکتا ہے، لیکن ہم گرفتارِ اسباب بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں، اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح — باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ!

محمد علی کی عمر کل ۵۲ سال کی ہوئی۔ حضور انورؐ نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا، قبل اس کے کہ مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے، خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کس کس طرح نکل کر نہ رہینگی!

راجہ علی محمد خاں

محمد علی کے بعد علی محمد — سنہ عیسوی کا آغاز تھا، کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا، سنہ ہجری شروع ہوا، تو علی محمد خاں نے سفر آخرت اختیار فرمایا قوم کا خادم، جب رخصت ہوا تھا، اور وطن کا مخدوم اب

آج وہ، کل ہماری باری ہے!

آج "مہاراجہ" کی باری آئی، کل "مہاپرجا" کی باری تھی۔ شب برات میں ایک کی طلبی ہوئی، محرم میں دوسرے کی سُناؤنی سُننی پڑی۔ غرباء کا جگر "کل" پھٹ چکا تھا، اُمراء کا بازو "آج" ٹوٹ کر رہا! کن کن حسرتوں پر روییے، اور دل کو کیا کہہ کر سمجھایئے! خاص و عام، امیر و غریب، راجہ اور پرجا، سب کے سب، اب حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھ کر مجبور، اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم! انسان ضعیف البنیان، کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کو اپنی مرضی کے تابع دیکھنے کا آرزومند، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک کبھی پروا کی گئی ہے! جس حکمت کاملہ نے، عالم کے سرور و سردار کو مخاطب کرکے انک میتٌ و انھم میتون کی منادی کردی، اُس کی مشیّت کے آگے، ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہوسکتی تھی؟ جو بھیجے گئے تھے، وہ واپس بُلا لیے گئے، اور جس نے بھیجا تھا، وہ اُسی آن اور اُسی شان، اُسی جاہ اور اُسی جلال، اُسی تزک اور اُسی احتشام، اُسی دارائی اور اُسی کبریائی، اُسی جمال

اور اُسی دلربائی، اُسی ناز اور اُسی محبوبی، اُسی حسن اور اُسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں، قائم و موجود، حی و قیوم!

مِٹ گیا نقش احمد و محمود رہ گیا، لا الہ الا اللہ!

کہتے ہیں، کہ راجہ (پُرانے نیازمندوں کی زبان بجائے لفظ "مہاراجہ" کے "راجہ"، ہی کی عادی ہے) علی محمد خاں شیعہ تھے، ہو نگے، زبانوں پر چرچا ہے، کہ بڑے نیشنلسٹ تھے، یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن میں جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا، وہ مسلمان ہی تھے، اور بڑے مسلمان۔ اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی سی تڑپ اور طپش نہ سہی، پھر بھی زبان پر محمدؐ کا کلمہ، دل میں اسلام کا درد، اور دماغ میں مسلمانوں کی خیراندیشی۔ دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود، خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لیے کھلی ہوئی، دولت کی تمنا تھی، تو مسلمانوں پر زرپاشی کے لیے اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لیے۔ ایک کرم کا دریا تھا افرادِ قوم کی آبیاری کو۔ ایک جود و عطا کا بادل تھا، جو اُمنڈ امنڈ کر برسا، اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبۂ حدود میں تشنۂ لب نہ قوم کو چھوڑا، نہ اِفراد قوم کو! اُس کا در حاجتمندوں کا مرجع، اُس کی ڈیوڑھی ناداروں کی اُمید گاہ۔ کم نصیب تھا وہ جو اُس کے ہاں سے مایوس، اور اُس کے پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سُنّی مسلمان، حج کے لیے روانہ ہوتا ہے، اور رخصتی ملاقات کے وقت اپنے لڑکے کا ہاتھ اس "شیعہ" رئیس کے ہاتھ میں دے جاتا ہے۔ حاجی کو حج مبرور نصیب ہوتا ہے، اور استراحتِ دائمی کے لیے حرم پاک کی سرزمین۔ یتیم لڑکا کالج میں زیر تعلیم ہے، اور ختم تعلیم میں ایک سال کی

مدت باقی ہے۔ دریا دل "شیعہ" رئیس کو اطلاع ہوتی ہے، اور بارہ مہینے کے بجائے سولہ مہینے کے لیے پچاس روپیہ ماہوار کے حساب سے پورے آٹھ سو کی رقم، بنک میں اُس کے نام سے جمع ہو جاتی ہے ——— لکھنؤ کے ایک نہایت شریف و ممتاز سُنّی گھرانے کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے، سامان غریبانہ حیثیت کا بھی میسّر نہیں، "شیعہ" رئیس کو خبر ہوتی ہے، اور دوسری صبح کو ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک پورا سیکڑہ چُپ چُپاتے، اُسی بیوہ کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے ———
میں جس 'محمود آباد' کے غم میں افسردہ و ملول ہوں، وہ یہ تھا۔ اُس کی فیاضیوں کے بے شمار واقعات میں سے یہ دو صرف نمونہ کے طور پر یاد دلا دیے گئے۔ وہ قومی لیڈر، اور نیشنلسٹ پارٹی کا افسر، مسلم لیگ کا صدر، اور مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر، لکھنؤ یونیورسٹی کا ساعی اور اودھ چیف کورٹ کا بانی، تِلک کا دوست اور مسٹن کا دشمن، آئی، ڈی، بی کا مالک اور ہمدم کا پروپرائٹر، حکومت کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا منظورِ نظر نہیں، وہ مسکین نواز و یتیم پرور، شریفوں کا سرپرست اور حاجتمندوں کا حاجت روا، بے وارثوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر، مہمان نواز و سیر چشم، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا۔ اُس کے بڑے بڑے شاہانہ چندے اور لکھو کھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں، اُس کی چھُپی ہوئی خیرات، اور پوشیدہ زرپاشیوں کی خبر، مخلوق میں سے کس کو؟

دُنیا اور اُس کی جگمگاہٹ ختم ہو چکی، نیشنلزم اور کمیونلزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے مالک کے پاس پہنچ چکا۔ راجہ، پرجا بن کر، حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، رزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوتِ خطابت کے کمالات دکھائے جا رہے ہیں، اور شعراء نامدار مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مہذب دنیا کی ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر، آئیے ہم اور آپ مل کر، سیکڑوں اور ہزاروں، محتاجوں اور درد مندوں، یتیموں اور

بیواؤں مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہوکر، مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت اُس ربّ الارباب کے حضور میں پیش کریں، جس نے اپنی رضا، ناتوانوں اور کمزوروں، بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے، آج نہ راجگی باقی ہے نہ مہاراجگی، نہ ٹیلر کی دوستی کام آرہی ہے، نہ حکومت کی ہوم ممبری، نہ کے، سی، اس، آئی کا خطاب پوچھا جارہا ہے، نہ انجمن تعلقداران اودھ کی صدارت۔ نہ کوئی مصاحب رفیق ہے، نہ کوئی مشیر۔ ہاں، آج قدر ہو رہی ہے، تو اُن بھوکوں کے کھانا کھلانے کی، جو دانہ دانہ کو ترس رہے تھے، اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی، جو ایک ایک دھجی اور ایک ایک چیٹ کے لیے آسمان کا منہ تک رہے تھے۔ جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بیچارے تھے، وہ خالق کے دربار میں رفعت والے نکلے۔ جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دے دے کر نکالا تھا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں۔ جس نے دنیا میں اِن ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا، اِن ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا، اُس کی بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی سہی، کیا اُس مولا کے دربار میں، جو کریموں کا کریم ہے، اُس کے ساتھ بجز لطف و مرحمت، بجز عفو و مغفرت کے، کسی اور معاملہ کی بھی توقع ہو سکتی ہے؟ جا، اے نیکدل رئیس، اے امت مرحومہ کے غمخوار و غمگسار، اپنے رب اور اپنے مولا کے حضور میں خوش خوش جا، خائف و متردد نہ ہو، کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی پر، یتیموں کی فوج کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں، اور بیکسوں اور بینواؤں کی صفیں کی صفیں ہیں!۔

ہمنام نامور
عبدالماجد بدایونی

سنہ عیسوی کا آغاز تھا، کہ قوم کو ناخدائے قوم، محمد علیؒ کا داغ سہنا پڑا تھا، سنہ عیسوی ختم ہو رہا ہے، کہ محمد علیؒ کے دوست و محب، عبدالماجد بدایونی نے، یک بیک اور دفعتہً اپنے پست اور ادنیٰ رفیقوں کو چھوڑ چھاڑ کر، اس بیوفا دنیا سے منہ موڑ کر، "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے! سنتے چلے آئے تھے، کہ آغاز اور انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے، اور "اوّل با آخر نسبتے دارد"، کسے خبر تھی۔ کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا، وہ ختم بھی یوں ہوگا، اور کون کہہ سکتا تھا، کہ ملت کے حق میں، یہ پرانی ضرب المثل، اپنے اس دردناک معنی میں صادق آکر رہیگی!

شعبان سنہ ۴۹ھ آیا، تو ماتم اس کا کرنا پڑا، جو تحریک خلافت کا بانی و علم بردار تھا۔ شعبان سنہ ھ آیا، تو زخم اُس کا اُٹھانا پڑا، جو اِس وقت خلافت کمیٹی کا صدر تھا! کہتے ہیں، کہ اسی ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے، جس میں سال بھر کے لیے، افراد و اقوام کی قسمتوں کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، کیا ہم شوربختوں کی قسمت میں، اب لیلۃ البرات کے معنی، صرف نالہ و فریاد، یتیمی و بیوگی حسرت و حرماں، غم و الم، شیون و ماتم کے رہ گئے ہیں؟ ——— نہیں، شعبان کو تو نبیؐ نے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے، شعبان شہری کے خلعت سے سرافراز کیا ہے، اسے سال کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے (کان احب الشہور الی رسول اللہ صلعم شعبان۔ ابوداؤد) حق ہے، کہ اُس آقاؐ کے سرفروش غلام

اس جھینہ کو اپنے لیے اختیار کریں، اور اُس شمع کے پروانے، اپنی اپنی جان کے نذرانے، اسی محبوب زمانہ میں، لے لے کر آگے بڑھیں!

مرحوم، بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے۔ ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دوسروں کو کھلا کر کھانے والے۔ تحریکِ خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیارِ زندگی بدل دیا، اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر لی۔ جیل نہیں گئے، لیکن جیل پہنچنے کی کوشش میں کوئی کسر بھی نہیں اُٹھا رکھی۔ اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعتہً ترک کر کے، درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا مجاہدہ بھی، جیل خانے کے مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ خلافت، جمعیۃ علماء، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، اور آخر میں پھر خلافت، جس تحریک میں شریک ہوئے، دل و جان، شغف و انہماک، مستعدی و سرگرمی سے شریک ہوئے۔ جس کام کو ہاتھ لگایا، اُس میں جان ڈال دی۔ زندگی کے آخری ۱۱ - ۱۲ سال کا ہر گھنٹہ، بلکہ کہنا چاہیے، ہر منٹ، قومیات کے لیے وقف تھا۔ سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا۔ مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے باوجود، کام کے پیچھے دیوانے تھے، اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا ہوا، اور حجاز کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے، اور امین آباد پارک میں محفل میلاد، ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے تک بیان کر رہے ہیں۔ شانہ میں ورم، ہاتھ جھولے میں پڑا ہوا، لیکن یہ کیسے ممکن، کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو؟ والدۂ ماجدہ نزع میں، اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں، بہو کی آخری سانسوں کی اطلاع آ رہی ہے، اور آپ ہیں، کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رُلا رہے ہیں! کل لکھنؤ میں تھے، آج کلکتہ پہنچ گئے۔ عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا، نماز آ کر میرٹھ میں پڑھی۔ صبح پٹنہ میں تھے، شام کو معلوم ہوا، کہ دکن کے راستہ میں

ہیں! عجیب و غریب مستعدی تھی، عجیب تر ہمت و مردانگی!

تحریکِ خلافت کے، کم از کم اپنے صوبہ میں تو شاید سب سے بڑے پُرجوش مبلغ و علم بردار رہے۔ مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر، واقع مارچ ۱۹۲۲ء میں، جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی، اُس کی گونج گویا اب تک کانوں میں سمائی ہوئی ہے۔ کانگرس نے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اُس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہر حال تھے، غالباً اُس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ اور تحریک تنظیم، ۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء والی تو جب تک زندہ رہی، بڑی حد تک انھیں کے دَم سے جیتی رہی۔ مسیح الملک اجمل خاںؒ مرحوم، اور رئیس الملّت محمد علیؒ، دونوں سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ شاید اُنھیں سے ملنے کی جلدی تھی، جو وہ مضطرب روح، سب کو مضطرب چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔

لکھتے اچھا تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن جیسا لکھتے تھے، اُس سے کہیں بہتر، بدرجہا بہتر، چند در چند بہتر، بولتے تھے۔ تقریر، اور موثر تقریر، کر ہر موضوع پر سکتے تھے، اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے، اور مجلس کو لُٹا دیتے تھے۔ لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفلِ میلاد تھی۔ حبیب رب العالمین کا ذکرِ پاک کرنے کو اُٹھتے، تو آپ میں نہ رہتے۔ بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے، اور شاخِ گُل کی طرح جھومتے اور لچکتے۔ خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی، اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منہ چومتی۔ ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا، کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا، اور ایک ایک جملہ، نظر آتا تھا، کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا ہوا، نکلتا چلا آرہا ہے! فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا، کہ اُبلا پڑتا ہے۔ کیا اِکی ربیع الاول میں جنت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی اِس کا شوق ہوا ہے، کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں، اُس کی نعت ایک خاکی کی زبان سے بھی سنیں؟

بڑے زبردست وخوش عقیدہ صوفی تھے۔ قادریّت توحدِ توغل تک پہنچی ہوئی۔ ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش، بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے پوری طرح معتقد۔ بڑے ذہین، بڑے ذکی، شوخ وطبّاع۔ بڑوں کی عظمت کرنے والے، چھوٹوں پر شفقت رکھنے والے۔ متواضع وخوش اخلاق، فیاض ومہماں نواز۔ سو وصفوں کا ایک وصف یہ تھا، کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے، دل سے ملتے، تکبر سے دُور، تمکنت سے نفور۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہوجاتے اور اپنے اعزاز ووقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست ہوگئے، آخر تک ساتھ دیا، حقِ نباہ دیا۔ وضعدار ایسے، کہ دوستوں اور دوستی کے اوپر سب کچھ قربان کردیا۔ لڑتے تو معاف کرنے پر تیار ہو جاتے۔ روٹھتے، تو بخشنے میں دیر نہ کرتے! دوستوں سے خفا ذرا جلد ہوتے خوش جلد تر ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے، اور خدمت پر ہر چھوٹے بڑے کی کمربستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مُرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی، خود دوڑ دوڑ کر مہمانوں تک کھانا پہنچاتے تھے، اور شیخ ہو کر مُریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔

مرنے والے، اپنے مالک ومولا کے حضور میں جا اور اپنے ایک ادنیٰ وگمنام ہمنام کا آخری سلام لیتا جا۔ تونے اپنے وطن سے دُور، مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچّے سردارؐ نے اس موت کو شہادت کی موت فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقاؐ نے اپنا سفرِ آخرت دوشنبہ کی صبح کو اختیار کیا تھا، تیرا رختِ سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل، شب دوشنبہ میں بندھا۔ تیری خوش نصیبی میں کیسے شبہہ؟ لیکن یہ تو بتا، کہ تو دوسروں کے بچّوں پر رحیم وشفیق تھا، آج خود تیرے کمسن بچّوں اور بچیوں کے سر پر ہاتھ کون پھیریگا؟ تیرا دردمند دل بیوہ کی اعانت کے لیے تڑپ جاتا تھا، آج خود تیری لُٹی اور اُجڑی ہوئی بیوہ کی غمگساری کون کریگا؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوتِ بازو تھا، آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھیگا؟

توقوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا، اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کریگا؟ —— ہاں، وہی کریگا، جو تیری طرح فانی نہیں، باقی ہے، عبدنہیں، رب ہے، بے بس نہیں، قادر ہے۔ جو ہریتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لیے شوہر سے کہیں بڑھ کر غمگسار، ہر مسلمان کے لیے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت، اور قوم کے حق میں ہر سردار قوم سے کہیں بڑھ کر ناصر وحافظ ہے ....

....

جو اُن کا سہارا ہے، جن کا کوئی سہارا نہیں۔ اور جوبس خاک کے پُتلے سے، جب تک جو کام چاہتا ہے، لیتا رہتا ہے، اور جب چاہتا ہے، اپنے حضور میں واپس بلا لیتا ہے۔ بقا ہے، تو ایک اُسی کی ذات کو، اور دوام ہے، تو بس اُسی کے نام کو، اور اُسی کے کام کو!

انجیل اہل انجیل کی زبان سے

اہل انجیل، جسے مسلمان قرآن مجید ہی کی طرح کی کتاب لفظاً لفظاً اللہ کے ہاں سے اتری ہوئی مانتے ہیں، وہ کیا ہوئی، یہ ایک بالکل علیحدہ بحث ہے۔ یہاں انجیل سے مراد، انسانوں، عام انسانوں کا لکھا ہوا وہ مجموعۂ کتب ہے، جسے آج مسیحی اپنی "الہامی کتاب" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں کے عوام ہی نہیں، اچھے اچھے علماء تک اس سے ناواقف ہیں کہ خود مسیحی اپنی اس "آسمانی کتاب" کے باب میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں، اور اُسے کیا کہکر، کس حیثیت سے، دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مسلمان اپنی سادہ دلی سے اس مروج انجیل کو بھی قرآن ہی پر قیاس کیے ہوئے اسے اُسی قسم کی ایک چیز (گو محرف صورت میں) تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ اور اپنے نزدیک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتے ہیں، اُسی طرح مسیحی بھی (گو کسی قدر مبالغہ کے ساتھ) حضرت مسیحؑ کو پیمبر مانے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں مفروضے تمامتر غلط ہیں۔ کوئی عیسائی نہ حضرت مسیحؑ کو پیمبر مانتا ہے نہ انجیل کو کتاب آسمانی۔ حضرت مسیحؑ کی پیمبری و اُلوہیت پر گفتگو تو انشاء اللہ پھر کبھی آئے گی۔ آج صرف یہ دکھانا ہے کہ مسیحی عقیدہ اس نام نہاد "انجیل" یا مسیحی زبان میں "عہد نامۂ جدید" New Testament سے متعلق کیا ہے۔

مضمون ایک بڑے فاضل مسیحی اور مستند پادری، ڈاکٹر بارنس E. Mr. Barnes ڈاکٹر آف سائنس، فیلو رائل سوسائٹی بشپ آف برمنگھم کے قلم سے ہے۔ اور جدید کتاب Outline of Literature کی جلد اول میں چھپا ہوا موجود ہے متن میں محض ترجمہ درج ہوگا۔ حاشیے البتہ مترجم کے قلم سے ہوں گے)

عہد نامہ جدید کی کتابوں[1] کی زبان یونانی تھی[2]۔ اور سب لکھنے والے[3] حضرت لوقا[4] کے ممکن استثنار کے ساتھ یہودی تھے۔ لیکن ان کی یونانی ہومر[5] کے زمانے کی نہیں، بلکہ تھیوسی و ایڈسی[6] یا فلاطون[7] زمانے کی بھی نہیں اوہ جدید یونانی تھی یعنی ہمارے سنہ کی پہلی صدی کی وہ عام زبان جس میں لوگ اپنے دوستوں سے گفتگو اور اپنی بیویوں سے مراسلت کرتے تھے[8]۔ اس زمانے کی علمی

---

[1] صحیفے اسلامی اصطلاح میں انھیں صورتوں سے تعبیر کیا جا سکتا تھا موجودہ انکی تعداد ۲۷ ہے۔

[2] جو قطعاً حضرت مسیح کی زبان نہ تھی۔ حضرت اسرائیلی تھے اور اسرائیلیوں کی زبان پہلے تو عبرانی رہی تھی، بعد کو سریانی ہو گئی تھی۔

[3] یعنی محض ترتیب دینے والے نہیں، لکھنے والے" یا مصنفین انجیل! کوئی مسلمان غریب خواب میں بھی نعوذ باللہ "مصنفین قرآن" لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے!

[4] یہ مسیح کے صحابی یا حواری تو یقیناً نہ تھے۔ صرف پولوس کے دوست رفیق کی حیثیت سے مشہور ہیں، مصور و طبیب تھے۔ ایک انجیل ان کے نام سے منسوب ہے۔

[5] یونان کا بہت قدیم شاعر جس کا زمانہ کوئی ۸۵۰ ق م بتاتا ہے اور کوئی ۱۰۵۰ ق م

[6] مشہور یونانی مصنف سال وفات ۳۹۵ ق م

[7] مشہور فیلسوف۔ سال وفات ۳۴۷ ق م۔

[8] کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو اصل انجیلیں موجود ہیں (ترجمہ نہیں) وہ خدائی الفاظ ہیں

یونانی آورد سے بھری ہوئی تھی، جس کا مقصد قدیم ادبی طرزِ انشار کی نقالی تھی۔ عہد نامۂ جدید کی زبان اُس سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتی رہی۔ یہانتک کہ ابھی حال ہی میں اُس عہد کے خانگی اور تجارتی مراسلات۔ کا پتہ ریگستان مصر سے چلا، اور جب اس کی صحیح نوعیت منکشف ہوئی۔[۱]

عہد نامۂ جدید کے مصنفین نے بجا طور پر اس عوامی زبان کا استعمال کیا۔ اس لیے کہ اُن کے پیشِ نظر مسیحیت کا پھیلانا تھا، نہ صرف ایک تعلیم یافتہ اقلیت کے درمیان بلکہ وسیع سے وسیع حلقے میں[۲] مسیحیت کے قبول کرنے والے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ تو خیر کیا ہوتیں، حضرت مسیح کی زبان میں بھی نہیں! صرف اُس زبان (یعنی یونانی) میں ہیں، جو حضرت مسیح کے وقت سے ایک صدی کے اندر فلسطین میں رائج ہو گئی تھی!

لہ۔ انجیلوں کی زبان اُس زمانے کی دوسری یونانی تصانیف سے خاصی مختلف ہے۔ اور یہ اختلاف علماء انجیل کو ابتک سخت حیران کیے ہوئے تھا، مضمون نگار اس الجھاؤ سے مخلصی یہ کہکر دلا رہا ہے کہ اس وقت کی جو خانگی تحریریں حال میں برآمد ہوئی ہیں، ان کی طرزِ انشاء بالکل اناجیل سے مطابق نکلی۔ گویا انجیل نگاروں نے اپنے زمانے کے علمی و ادبی معیار کا نہیں، بلکہ خانگی اور گھریلو تحریروں کا اتباع کیا ہے۔

لہ۔ گویا اس سے کوئی بحث ہی نہیں، کہ اصل وحی یا الہام کا نزول ہوا کس زبان میں تھا۔ یہانتک کہ یہ سوال بھی قابلِ التفات نہیں کہ حضرت مسیح نے اس پیام کو ادا کس زبان میں کیا تھا! بلکہ اصل مسئلہ کوئی بہت ہی مہتم بالشان، صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ تبلیغ کے اغراض کے لیے، عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک پہنچنے کے لیے، کون موزوں ترین زبان مسیح کے حواریوں، شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کو مل سکتی تھی!! گویا مسلمان اس سوال کو نظر انداز کردیں کہ قرآن کا نزول کس زبان میں ہوا تھا، اس کو بھی بھول جائیں کہ جس پر نازل ہوا تھا، اس کی زبان کیا تھی؟ اور بحث صرف اس سے رکھیں کہ صحابیوں

اب زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھیں آج کی زبان میں ادنیٰ طبقہ متوسط (لوور مڈل کلاس) کہا جائے گا۔ مسیح کے خصوصی شاگردوں میں بھی زیادہ تر لوگ اسی طبقے کے تھے بعض مثلاً فرزندان زبدی، غالباً خوشحال بھی تھے لیکن بہرحال غلاموں کے طبقے سے تو سب ہی اوپر تھے۔ ابتدائی مبلغ، ہر طبقے کے مردوں عورتوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔ ان لوگوں نے گو استعمال بول چال والی یونانی کا کیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ لوگ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ حضرت پولوس[1] جو پوری مذہبی تربیت پائے ہوئے تھے، غالباً ایسے والد کے فرزند تھے جو اپنے شہر میں خاصی حیثیت رکھنے والے تھے[2]۔ حضرت لوقا اور حضرت یوحنا[3] مبلغ دونوں قابل و تعلیم یافتہ شخص تھے اور عہد نامۂ جدید کے دوسرے مصنفین بھی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ گو ان میں سے غالباً کسی کی بھی وہ مادری زبان نہ تھی۔

عہد نامۂ جدید کے مصنفین نے اگرچہ زبان ایسی اختیار کی جو علمی نہ تھی، تاہم جیسا کہ ہمارے (انگریزی کے) مستند ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اکثر اونچے معیارِ فصاحت تک پہنچ جاتے تھے اس اذعان کے ساتھ کہ وہ ایک عظیم الشان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ بلکہ تابعین کو ملک در ملک تبلیغ کے لیے سہولت کس زبان میں تھی، فارسی میں، پہلوی میں، وقس علیٰ ہذا، اور وہی زبان (نعوذ باللہ) اب قرآن کی زبان ہو!!

[1] سینٹ پال۔ تاریخ مسیحیت کی سب سے زیادہ مشہور و اہم شخصیت۔ کہنا چاہیے کہ موجودہ تثلیثی مسیحیت کے بانی۔ مسیح کے صحابی یا حواری یقیناً نہ تھے۔

[2] دوسرے انجیل نگاروں کی طرح انکے حالات و سوانح بھی تاریخ کی نظر سے مخفی ہیں۔

[3] سینٹ جان لیوک۔ ملاحظہ ہو حاشیہ [2]

[4] سینٹ جان حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں ایک نام ان کا بھی آتا ہے۔ "چار مستند" اناجیل میں سے آخری انجیل انھیں کے نام سے منسوب ہے

پیام پہنچا رہے ہیں، ان کی تحریروں میں آمد اور بے تکلفی ہے حضرت مرقس کی یونانی ناشستہ ہے تاہم بڑے اختصار کے ساتھ انھوں نے تذکرے کی ضرورت کو بڑے پرقوت اور بڑے پراثر انداز سے پورا کردیا ہے۔ حضرت پولوس اپنے خطوط ایک کاتب کو بول کر لکھاتے تھے۔ ان خطوط میں ناتمام فقرے بھی ملتے ہیں، اور پیچیدہ دلائل بھی، اور نیز انتقال خیالات بھی۔ ان کے پڑھتے وقت پولوس مبلغ کی تصویر ہمارے ذہن کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے مطالعہ کے وقت ہم دنگ رہ جاتے ہیں اُن کے دماغ کی نکتہ آفرینی پر، ان کی دقت نظر پر اور اُن کی قوت تخلیقی پر۔ اور کہیں کہیں تو فصاحت بیان کے اس معیار پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس کی نظیر لٹریچر میں کہیں نہیں ملتی۔ حال کے ایک فاضل نے حضرت یوحنا کی تحریر کے متعلق لکھا ہے کہ

"صرف ونحو تو خیر اس کی صحیح ہے، لیکن اس کی سادگی بیان خشکی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اور محاورہ کی تو اس میں چاشنی ہی نہیں۔"

باایں ہمہ اگرچہ ان کو اس زبان کے لکھنے میں بڑا زور لگانا پڑا ہے، جو اُن کی اپنی نہیں، تاہم ان کی چوتھی انجیل اور ان کا مکتوب اول ادبیات کے روشاہکار ہیں۔ وہی الفاظ دہرا دہرا کر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بے ربط جملے ایک دوسرے کے بعد ملتے ہیں۔ کسی طرح کی ان میں صنعت گری نہیں ہے۔ ہر چیز "پوست واستخوان" نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں توقع تو ناکامی محض کی ہوتی ہے، لیکن واقعہ بہترین جمال روحانی ہاتھ آتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صوفی اور فلسفی بچہ کی زبان میں گفتگو کر رہا ہے اور کسی دوسرے نے انسان کی قسم روحانی کو اتنا مالامال نہیں کیا ہے۔ عہدنامہ جدید کے مصنفین میں سب سے زیادہ خوش قلم حضرت لوقا ہیں۔ ان کی انشار کی شستگی وروانی، ان کی وسیع الخیالی ان کی نزاکت احساس سب آج کے مذاق کے مطابق ہیں۔ اس کی قوت بیانیہ غضب کی ہے، اور اس کا ثبوت ان کے قلم

سے نکلے ہوئے حضرت پولوس کے واقعۂ تباہی جہاز سے ملتا ہے۔ اور اگر کسی صاحب کو اُن کے بلکہ ادبی میں شبہہ ہے، تو وہ بطور خود مُسرف بیٹے کی حکایت کے لکھنے کی کوشش کر کے دیکھ لیں۔ یہ حکایت خود یسوع سے، تغیر خفیف کے ساتھ نقل ہوئی ہے، اور یسوع کی تعلیم کے ادبی پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں

عہد نامۂ جدید پر ادبی تبصرہ میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یسوع ناصری کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی شخصیت سارے صحیفوں کے مجموعے پر حکمران ہے، اور وہی اُس میں اندرونی وحدت پیدا کیے ہوئے ہے۔ یسوع کی تعلیم خدا اور انسان کے باب میں، اس کی موت، اس کی سیرت کی کاملیت، نوعِ انسانی کے حق میں اُس کی اہمیت۔ بس اسی قسم کے مسائل تو مصنفین[1] عہد نامۂ جدید کے موضوع تحریر ہیں۔ اور پھر جب ہم یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ مصنفین بیشتر ایسے تھے، جنھیں یسوع سے کوئی ذاتی واقفیت تھی ہی نہیں[2]۔ نیز یہ کہ ان کی شہادت عینی نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے، تو البتہ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسیح نے کتنا مضبوط اور گہرا اثر اُن لوگوں پر ڈالا ہو گا جو اس کی مختصر سی تبلیغی زندگی میں اس کے ساتھ رہے تھے[3]۔ مسیح کی زندگی کی جو تصویر ہمارے پاس ہے، اُس کے اہم عنصروں میں تو کوئی پوشیدگی ہے نہیں، ہم کو مسیح کے خیالات معلوم ہیں،

---

[1] ۔ ایک بار پھر ذہن نشین کر لیجیے کہ یہی جب جب اپنی "آسمانی" کتاب کا ذکر کرتے ہیں، اسکے لیے "مصنفین" لاتے ہیں۔ قرآن مجید کی طرح اُس کے ایک کتاب کے ہونے، اور آسمان سے لفظاً نازل ہونے کا تو ان بیچاروں کو خواب و خیال میں بھی دعویٰ نہیں۔

[2] ۔ یعنی یہ انجیل نویس صحابی بھی نہ تھے۔

[3] ۔ تاریخی اسناد کے کمزور نہیں، سرے سے مفقود ہونے کی یہ توجیہ کتنی معقول ہے کہ راویوں کے لیے رویت عینی وغیرہ کی ضرورت ہی کیا تھی حضرت مسیح کی زبردست قوتِ باطنی کافی تھی جو صحابیوں اور پھر اُن صحابیوں کے صحابیوں کو درجہ بدرجہ متاثر کرتی رہی!

مزاج معلوم ہے نہ سیرت معلوم ہے[ل] ۔ ایسی کہ تاریخ میں اس کی مثال بہت بہت ہی کم اشخاص سے متعلق ملے گی۔

انجیلوں میں اس کی تعلیمات جو مندرج ہیں، وہ شاید ہماری توقع سے کچھ زیادہ ہی مفصل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم ترین انجیل بھی جب لکھی گئی ہے تو اس وقت مسیح کی وفات کو کم از کم تیس سال ہو چکے تھے[۲]۔ لیکن یہود کا حافظہ غضب کا تھا، بہ خلاف ہم لوگوں کے، کہ ہمارا سہارا تحریری یادداشتیں ہیں۔ اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ نصف صدی گزر جانے پر بھی تعلیماتِ مسیح کے اجزا صحیح طور پر محفوظ رہ گئے ہوں[۳]۔ یسوع کی پیدائش اغلباً ۶ق م کی ہے۔ اور مصلوب وہ ۲۹ء میں ہوئے۔ اُن کی بول چال زبان فلسطین کی آرامی زبان تھی۔ لیکن وہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، اور غالباً یونانی (رومی) زبان بول سکتے تھے۔ اُن کی پیدائش سے ایک صدی قبل ہی گلیل[۴] کی آبادی کا بڑا حصہ غیر یہودی ہو چکا تھا۔ وہ غیر قوموں کی گلیل[۵] تھی اور مسیح کی زندگی ہی میں کفرنحوم[۶] اور آس پاس کے شہر جس قدر یہودی تھے اسی قدر یونانی و شامی بھی تھے۔ ناصرہ[۷] کے قریب ہی جس کی آبادی عجب نہیں کہ ۱۰ ہزار کی ہو،

[ل]۔ اور ان سارے معلومات کا ذریعہ؟ انہیں راویوں کا بیان، جو سند متصل سے یکسر عاری و محروم ہیں!

[۲]۔ اور وہ انجیل بھی آج ناپید ہے۔

[۳]۔ "محفوظ رہے ہیں" نہیں۔ بلکہ "قرین قیاس ہے کہ محفوظ رہ گئے ہوں ——" اس برتے پر اس کتاب کو قرآن کے سامنے لایا جا رہا ہے!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

[۴]۔ galilee ملک شام کا وہ ضلع جو حضرت مسیح کے خاندان کا مسکن تھا۔

[۵]۔ حوالہ انجیل کا ہے۔

[۶]۔ Capernaur حضرت کے وطن قصبۂ ناصرہ سے متصل ایک موضع۔

[۷]۔ ضلع گلیل کا قصبہ۔ حضرت کا آبائی وطن۔

بڑی بڑی شاہراہیں گزری تھیں جو علاقہ لیوانٹ[1] کے بڑے بڑے شہروں کو ملائے ہوئے تھیں۔ غرض یہ کہ یسوع کا ظہور اگرچہ ایک نجار کے جھونپڑے سے ہوا تھا[2] تاہم وہ اپنی نوعمری میں وسیع دنیا سے بیگانہ نہیں رہے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود ہی تھے! جیسا کہ پروفیسر بیک نے کہا ہے،

"تاریخ میں کوئی ایسی ہستی نہیں ملتی جو اعتدال اور توازنِ دماغ میں ان سے کامل تر اور اخلاص میں اُن سے برتر، اخلاقی احکام میں اُن سے زیادہ دقیق النظر، اور باطل کی تردید میں اُن سے زیادہ بے لاگ ہو۔"

اُن کی تعلیم کا واضح ترین نمونہ ان کی بیان کی ہوئی تمثیلوں میں اور اس مجموعۂ ارشادات میں نظر آتا ہے، جسے ہم پہاڑی کا وعظ کہتے ہیں[3]۔ یہ اقوال اپنے متکلم کی خاص مذہبی ساخت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ان کے اندر بلند ترین اخلاقی تخیلات چھوٹے چھوٹے فقروں اور چٹکلوں کے اندر بند ہیں! احکام جو ہیں وہ بالکل صاف سیدھے، غیر مبہم و مخلصانہ ہیں۔ گویا بیان کی سادگی اور عقیدے کی پختگی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے ہیں۔ متکلم کے نزدیک جس طرح زمین کا وجود یقینی ہے، آسمان کا بھی ہے۔ اُسے انسانوں کے سے زیادہ خدا کی حیثیت نصیب ہے۔ اسے قلبِ انسانی سے متعلق گہری بصیرت حاصل ہے۔ اور ایسا ہی عمیق ادراک خدا کی ذات و صفات سے متعلق۔ اس کا نہ قدم کہیں لڑکھڑاتا ہے، نہ وہ کبھی ابہام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کا دماغ حیرت انگیز حد تک زرخیز ہے، ہر ظاہری تضاد کے درمیان وحدت پیدا کر دینے والا۔ اور اگر استعارہ کی زبان کے استعمال کی اجازت ہو تو

---

[1] louant روم کا ساحلی علاقہ شام، ایشیائے کوچک کی جانب۔

[2] حضرت مریمؑ کے منگیتر (حسبِ روایت انجیل) شوہر۔ حضرت یوسف نجاری کا پیشہ کرتے تھے۔

[3] Serman on the Mount یہ وعظ انجیل متی باب ۵ سے باب ۷ تک آیا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس کی طباعی ایک مذہبی و اخلاقی صنّاع کی طباعی ہے۔ اُس کے اندر وہ خشک متانت ہے جو حکمتِ اعلیٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا پر سکون اقتدار ہیبت آفریں اور عظمت آفریں ہے باقی ہم تو یہی کہتے ہیں کہ اُسے جو احترام اور جو محبوبیت حاصل ہے وہ انسانی تاریخ میں اور کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ اور یہیں سے ہے کہ اناجیل اربعہ جس بڑی تعداد میں طبع ہوئی ہیں اور جس بڑی تعداد میں اور جس غور و توجہ اور جس عقیدت سے پڑھی گئی ہیں وہ بات کسی کتاب کو بھی حاصل نہیں ہوئی ہے

ان میں سب سے قدیم انجیل حسبِ روایت حضرت مرقس ہے یہ غالباً سنہ ۷۰ء سقوطِ بیت المقدس کے وقت معرضِ تحریر میں آئی[1]۔ یہ بھی ممکن کہ اس کے دس سال بعد۔ اس کا ماخذ وہ عام تبلیغ ہے جو حضرت پطرس اور قدیم ترین مبلغین کیا کرتے تھے[2]۔ اس کے مصنف جان مارک (یوحنا مرقس) ہیں برنا باس کے بھتیجے اور وقتاً فوقتاً حضرت پولوس کے رفیق۔ جب یسوع کے جاننے والے دنیا سے اُٹھنے لگے تو حضرت مرقس دائرۂ تحریر میں لے آئے۔ دیانت اور خوش تاثیری کے ساتھ اس سرگزشت کو جو انکے لیے مایۂ بشارت تھی، اُن کی انجیل وہی تھی۔ انھوں نے اس کتاب میں یوحنا بپتسمہ دینے والے[3] کے آخر زمانے کے حالات کو بھی شامل کر لیا جو انھیں غالباً نبی موصوف کے کسی پیرو سے مل گئے تھے۔ اور باب ۱۳ میں وہ چھوٹا سا مکاشفہ بھی شامل کر دیا جس کے اندر کسی مسیحی یہودی نے اپنے نظریۂ قیامت کے ساتھ مسیح کی پیشگوئی بربادی بیت المقدس کو مخلوط کر دیا ہے۔

انجیل حسبِ روایت حضرت لوقا اور رسولوں کے اعمال ایک ہی شخص کی تصنیف ہیں، جس نے اعمال کے نصف آخر میں ایک مسافر کے روزنامچہ کے اجزا بھی شامل

---

[1] العظمۃ للہ! قدیم ترین موجودہ انجیل بھی سنہ ۷۰ء میں تالیف ہوئی اور وہ بھی "غالباً"!

[2] یعنی براہِ راست حضرت مسیح کے ارشادات اس میں بھی نہیں بلکہ اس کا ماخذ بھی بعض حواریوں کے بیانات!

[3] John the Baptist یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام۔

کر دیے ہیں، جس نے حضرت پولوس کے ساتھ سفر کیا تھا جب وہ روما میں قید ہو گئے تھے۔ اغلب یہی ہے کہ یہ روزنامچہ نویس حضرت لوقا ہوں اور اپنی نام والی انجیل اور اعمال دونوں کے مصنف ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اعمال میں حضرت پولوس کی شہادت کا ذکر اسلیے نہ ہو کہ وہ تصنیف ہی واقعہ سے قبل ہو چکی تھی اور اس صورت میں اس انجیل کی تصنیف کا زمانہ ۶۰ء کے قریب ماننا پڑے گا لیکن بہت سے فاضلوں کا خیال ہے کہ یہ اُسی وقت سے ایک نسل بعد کی تصنیف ہے اور بعض کا قول ہے کہ نہیں، بلکہ کسی مجہول الحال مرتب نے حضرت لوقا کے روزنامچہ سے کام لیا ہے بہرکیف اتنا تو اب بہ دلائل ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت لوقا اور انجیل حسب روایت حضرت متی کے مصنف دونوں نے انجیل مرقس سے کام لیا ہے، نیز ایک اور قدیم نوشتہ ہے جو اب گم ہو گیا ہے اس نوشتہ کا نام ماہرین فن نے اپنی اصلاح میں ق (Q) رکھ لیا ہے۔ یہ مسیح کی تعلیمات کا نہایت درجہ اہم بیان تھا، جسے متی حواری نے لکھا تھا۔ اس کا بڑا حصہ ہماری پہلی انجیل میں "پہاڑی وعظ" کے زیرعنوان آگیا ہے اور اسی مناسبت سے پہلی انجیل حضرت متی سے منسوب ہو گئی ہے ورنہ درحقیقت وہ لکھی ہوئی تو فلسطین کے کسی مجہول الحال مسیحی یہودی کی ہے اور زمانہ تصنیف تقریباً ۸۰ء ہے۔ اس لکھنے والے نے علاوہ مرقس اور ق کے پرانے حوالوں سے بھی کام لیا ہے، جن سے یہ ثابت ہو کہ مسیح وہی ہیں جن کی بابت پیشگوئی زمانۂ قدیم سے یہود میں چلی آرہی ہے۔ عہد نامۂ قدیم سے اس طرح کا کام لینا اس وقت کے احبارِ یہود کے طریق تفسیر مجازی کے عین مطابق تھا، گو اب ہم اُسے قابل اطمینان نہیں سمجھتے۔ اسی انجیل متی میں ہم کو کلیسا کے وہ رسوم بھی نظر آجاتے ہیں جو وفاتِ مسیح سے نصف صدی کے اندر پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بابت یہ اعتقاد تھا کہ وہ اس کی منظوری حاصل کیے ہوئے ہیں یہ کتاب عام عبادت گاہوں میں سنانے کے

لہ۔ گویا اناجیل اربعہ میں سے کسی کے بھی مصنف کا تحقیق کیا تو پتہ نہیں! سب خود محض ظن تخمین قیاس و استنباط ہے۔

لیے بہت موزوں ہے، اور اسے انجیلوں میں پہلے نمبر پر اس لیے رکھا گیا کہ ایک زمانے میں یہی سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔ موجودہ دنیا مرقس کی عزت زیادہ کرتی ہے، اس لیے کہ یہ قدیم تر ہے، تاہم کبھی زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے جب مرقس بھی نسخہ 'ق' کی طرح گم ہو جانے کو تھی۔ اور آخری حصہ تو اس کا ضائع ہی ہو چکا ہے۔ بہ قول پروفیسر برکٹ کے تمام موجودہ مسودات نقل ہیں صرف ایک نسخہ "فرسودہ" کے۔[1]

---

[1] وہ سب نقل ایک ہی "فرسودہ نسخہ" کے ہیں لیکن خود اس اکیلے فرسودہ نسخہ ہی کی صحت اور اصلیت کب ثابت ہے۔

جوہر اور ان کی شاعری

(۱)

آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنو کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاران کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روز اُن کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس لئے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا۔ (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجیے۔

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا۔ مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا "کچھ کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انھیں کے چند شعر انھیں سنا دیے سُن کر پھڑک گئے اور اُس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعوی کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعوی تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے۔ جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری (Official biography) (یعنی گورمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے "میری امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے ہمدرد کے منشی نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا)

تو ہمدردیں سے ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کردیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدردو الوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے۔ نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو۔ اور جواب دہی ہمارے سر آپڑے' آپ نفسیات کے ماہر ہیں' کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آئندہ والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کے نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کردو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے کہ گیارہ برس کی عمر میں علیگڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنادیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے' مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ' اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکّہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا

تھا میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لجر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الله جاج دیوتین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ اُن میں سے ایک خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکرٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر" اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی، ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔ ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کیساتھ

علیگڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی۔ مگر وہی فرضی معشوق اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہد ان اصلی کی کمی نہ تھی مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ ڈبرس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس

کسی اور کے خیال تے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالاتِ گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی، بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بنہایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکینِ قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touchstone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں۔ A poorthing but mine own

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں ..... (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں۔"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۱۹؍ اگست سنہ ۲۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں سنہ ۱۹۱۶ء کے

شروع میں اُسی نظربندی کی حالت میں، ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی پہلے انگریزی میں اور پھر اُردو میں۔ کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے، ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا۔ آپ اُوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کر کے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کر کر کے لکھے جاتے ہیں؟ ...... بچارے کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی!

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا تو اس حیثیت سے، کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں بولتے خوب ہیں۔ علیگڈھ کے فدائی ہیں "قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں پُرجوش ہیں، ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس 'لورتن' کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے یا (کانگریسی اُردو میں) "چنے گئے"۔ لوٹ کر آئے، بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی۔ شکسپیر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا۔ زبردست لکھ ڈالا۔ ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی اڈیٹر نہ تھے، اڈیٹر سے کہیں بڑھ کر صحیح معنی میں لیڈر تھے، اب قوم اُن کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی، بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر

ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لئے پکارا تو روپے کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آگیا، محمد علی دیوانہ دار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے ...... اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے، ہاں مستِ الست!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی عشرہ جنگ یورپ شروع ہو گئی ...... خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ، کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفہ اسلام کا پرچم لہرایا۔ ...... محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں۔ اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زباں بندی، معطلی کی نذر، شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں۔ ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں — اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اُس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں، مہر ہی مہر، لیکن حقیقتِ مہر کبھی کبھی صورتِ قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ، سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا۔ ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر — عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے نقد جاں کا مطالبہ ہونا تھا۔ ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے حصہ بقدر جثہ۔
یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر   دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرع لگایا ہے، یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے! اسی نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں، اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کردوں!

نظر بندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے تھپیڑے! ادھر ہندوستان کے اندر، حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا۔ کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے۔ اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر، دین کی تبلیغ بھی۔

اذاں حرم میں کلیسا میں، دیر میں ناقوس   کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا، "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڑھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ سنہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے۔ اور سنہ ۲۳ء تک کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ، سرکار دولت مدار کے مہمان! اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل جل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روئداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے۔ ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت   اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں!

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، استقبال ہیں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن، مذہب سے عزیز تر، دنیا دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! ...... وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر۔

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل وجان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سُن کر کیسا کچھ پھڑپھڑایا ہوگا دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے۔ ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، اور گڑگڑا، گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں۔

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا
تخرج الحی من المیت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے اُس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحبت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اُسے قبر میں بھی اتارا!

۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھیے
کہ محمد علی پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر
محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و
جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۱۹۲۴ء سے آغاز ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے، اور
بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے سلطان ابن سعود
کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے
جھگڑے اور بچھڑے۔

۱۹۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد ۱۹۲۹ء میں اُسے بھی
اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا۔ ہمدرد نکالا۔ مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں
کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے
یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ لیکن دل کی کلی جو الغائے خلافت
سے مرجھا چکی تھی، پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے۔ کہ
زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے بس وہ پورے کر رہے تھے!...... اب وہ
انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں
سفر آخرت! بدبینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے
کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی
ہے، یہ ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ
”آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر“
مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ
کی پندرہویں شب میں عین اُس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار
سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے،
مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی!...... شاید

اس لئے کہ اُس کے ہم قوم اور ہم وطن اُس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! آزادی، محمد علی کے ملک کو کیا ملتی، محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلہ اول ہیکلِ سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی، جا کس راستے سے رہا ہے۔ ؎

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر، اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور و شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اُس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہِ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی نہ دیباچے کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹئے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں، تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علیؒ ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے، اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو۔ ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو

مگر اے ہمنفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا

تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں

پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش　　تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا　　دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں، انگریزی ۱۹۰۷ء ہے۔ علیگڈھ، محمد علی کے محبوب علیگڈھ میں لڑکوں نے انگریز استاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس۱۰ برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں اتفاق سے وہی دن سر سید کی برسی کا ہے اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں، محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی۔ ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو

ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو

وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں

اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تمہیں ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں   نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز، کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سر شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں۔ ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین   کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے   ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے   ابھی دو چار خم پیئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی   کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ   ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے۔ یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں، نظر بندی کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا! خوب خوب تپے تپے کی کہنے لگے ؎

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو   ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اسے   اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیے!

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ ہے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتداء ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

"حنا" کا قافیہ اس "طرح" میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھئے، محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالیؔ کا اک لاجواب شعر ہے

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالیؔ بہر حال ایک مسلم استاد تھے جوہر اُن کے مقابلے میں مبتدی اور نو آموز محض پھر بھی شعر کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا۔

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم یہ اور تھا جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی "بی اماں" کا تھا، اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے۔ ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو   خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے، یا اپنی آٹو بیاگرافی (خود نوشت سوانحعمری) "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت   پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے   اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے۔ ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحبِ معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا۔ ع

ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔ جسم قیدِ فرنگ میں۔ دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور و دراز سے "اللہ اکبر" کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو، ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود، یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے۔ ؎

سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی
عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے۔ ؎

شیطانِ جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تقیہ آج ہو گئی کیدی متین کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اسکے باب میں
کٹ ہو گی لامکاں سے بیشتر مکین کی

تینوں حرم اُسی کے جو ہے لاشریک لہ
ترکیب سے ہے درست ہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے۔ چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے، جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں۔ ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

ایک اک کر کے سب کے سب تنکے
ہوئے برباد آشیانے کے

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھئے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آ گئیں! سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا کیا کچھ دکھا دیا۔ راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے

اُس عالم کے بھی دیتی چلی گئی۔ ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ‏ ‏ اب ہونے لگی اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے ‏ ‏ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے ‏ ‏ ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ‏ ‏ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ‏ ‏ بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزارہا آبادیاں، مشتِ خاک کا شمار اب عالمِ پاک میں تھا، لوہا جب تپ کر، دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہجاتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا، دیوانہ جسے ایک دوسرے دیوانے نے، بلا کسی ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا، اور خوب ہی کہہ ڈالا۔ ؎

بدینِ مصطفٰے دیوانہ بودی
فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست رانقابِ چہرہ کردی
وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق باکست
ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار تا یار
عجب مستے عجب دیوانہ بودی

زبان پر آئی ہوئی 'واہ' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی 'آہ' کی رسائی مالک عرش تک! رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی

روح بھی ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے، محاورات بتدیل ہو گئے، ترکیبیں نئی ہو گئیں، لیکن حی وقیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہر لئے بھی اپنے کو اُسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا' عجب کیا ہے کہ یہ کچھ زندگی اُن کے نصیب میں بھی آجائے!

بنیاد تمدن

فرنگستان کے موجودہ سیاسی مفکرین میں ایک ممتاز نام آکسفرڈ کے جوزف ٹوینی کا ہے۔ اجتماعی و تمدنی مباحث پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور قوم و نسل کے علمی مسائل پر ایک ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجینس اینڈ ایتھکس (اعیان و اخلاقیات کی دائرۃ المعارف) کی ضخیم و مستند مجلدات میں عنوان "نسل" Race پر مبسوط مقالہ انھیں کے قلم سے ہے۔ مقالہ کے اندر ہر صاحب فکر کے لیے بہت سی بصیرتیں موجود ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ قرون وسطی میں جب رومی یا لاطینی کلیسا نے مسیحیت کی منادی شروع کی، تو عالم انسانیت کو کل دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مسیحی و غیر مسیحی۔ مسیحی تو وہ جو فی الواقع اور فی الحال مسیحی ہیں، اور غیر مسیحیوں کی تعبیر اس نے یوں کی کہ بالفعل نہ سہی، بالقوۃ تو یہ بھی مسیحی ہیں۔ یعنی گو اس وقت منکر ہیں، لیکن صلاحیت تو بہر حال ان سب میں قبول مسیحیت کی موجود ہے، اور تبلیغ کے اثر سے ان کا مسیحی ہو جانا دائرہ امکان میں ہے۔ ان کے اور مسیحیوں کے درمیان کوئی ابدی تفریق قائم نہیں، کوئی دائمی و لازوال حجاب نہیں۔ چنانچہ جو جو قومیں مسیحیت قبول کرتی گئیں، اپنے پیش رو مسیحیوں کے معاشری و اعتقادی زندگی اختیار کرتی گئیں، ان کے اور قدیم مسیحیوں کے درمیان کوئی اور فرق کسی قسم کا قائم نہ ہوا۔

ہوتے ہوتے، اصلاحِ کلیسا کا زمانہ آیا۔ قدیم کیتھولک مذہب اور پاپائے روم

کے خلاف بغاوت شروع ہوئی، اور مارٹن لوتھر کے اثر سے پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ اب اہلِ یورپ کے فتوحات کا رقبہ وسیع ہوا، اور بحری ترقیوں کی بنا پر ایسی نئی نئی قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہوا جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھیں ان کی جلد کا رنگ یورپیاوں کے رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت کے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ ہی یورپ میں نہ تھا۔ آب و ہوا ان کے ملکوں کی یورپ کے ممالک سے بالکل مختلف تھی۔ یہ نیا تجربہ یورپ والوں کے لیے ایسا ہی تھا، جیسا اہلِ یونان کو اول اول اہلِ مصر سے سابقہ پڑنے پر پیش آیا تھا۔ لیکن یورپ کے دماغ نے اس سے جو اثر قبول کیا، وہ اس سے بالکل مختلف رہا جو اہلِ یونان کے دماغ نے اپنے زمانے میں قبول کیا تھا۔

یونانیوں نے استدلال یوں کیا تھا، کہ باشندوں میں اگر اس قدر اختلاف ہے، تو خود ان ملکوں میں بھی تو اسی قدر اختلاف موجود ہے، اور اس لیے انسان کے ظواہر کا یہ سارا اختلاف نتیجہ ہے اختلافِ ماحول کا، ورنہ حقیقت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ جوں جوں ماحول میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی نسبت سے خواص بشری میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اور شدید سے شدید اختلافات کے عقب میں بہرحال ایک وحدت کا وجود ہے۔ اہلِ یورپ پر اس کے برعکس، اپنے نئے سابقہ والوں کی اجنبیت کا دھاکا ایسا بیٹھا، کہ اس کھلی ہوئی توجیہ، یعنے اختلافِ ماحول کی طرف ان کا ذہن ہی نہ منتقل ہوا، نہ اس امر کی طرف کہ تمدن و معاشرت کے اختلاف کا ہر بڑے سے بڑا منظر بھی بہرحال تدریج ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بس ظواہر کے اختلافات سے وہ ایسا متحیر و مبہوت ہوئے کہ عوارض کو اصل قرار دے لیا، اور ظواہر کو حقیقت کی جگہ پر رکھ دیا۔ ان کے ذہن میں صورت استدلال یوں آئی، کہ یہ تو ممکن ہے، حبشی مسیحی مذہب قبول کرے، لباس اور معاشرت بھی یورپی اختیار کرے لیکن اپنے رنگ کو کیا کرے گا، یہ تو بہرحال اس کے اختیار

کی چیز نہیں۔ گورا، زندگی بھر گورا ہی رہے گا، اور کالا مدۃ العمر کالا۔

یہ اختلاف رنگ کی اہمیت یوروپین دماغ پر اس درجہ مسلط ہوئی، کہ اس کا مطلق کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور رنگ کو گویا مستقل، نوعی، اختلاف کی بنیاد قرار دے کر اُس نے انسانیت کی تقسیم مہذب و غیر مہذب دو حصوں میں کر دی اب نئے نظریے کے مطابق، دنیا کی آبادی، مسیحی و غیر مسیحی میں تقسیم نہ رہی، بلکہ اب دو صنفیں، گوری قوموں اور کالی قوموں کی قرار پا گئیں، جن میں سے ایک کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اپنے ارادے سے، اپنے اختیار سے، کام لے کر، دوسری میں داخل ہو سکے۔ اس تقسیم کے بعد خود یورپ کی ذہنیت بھی غیر متاثر نہ رہی۔ اور جس طرح یونانیوں کے اس نظریے کے بعد، کہ مصریوں کا مختلف تمدن مختلف ماحول کا نتیجہ ہے، خود یونانیوں میں قومی عصبیت ہلکی پڑ گئی تھی، اور اس کی جگہ نرمی، فراخ دلی، اور رواداری زیادہ پیدا ہو گئی تھی، اسی طرح یورپ کی ذہنیت پر، اس گوری اور کالی انسانیت کی ناقابل اتصال و ناقابل التیام تفریق کا اثر یہ پڑا، کہ اس کی قومی اور نسلی عصبیت اور زیادہ گہری ہو گئی، اور غیر یورپی قوموں سے اختلاط کا امکان ہی جاتا رہا۔

یہاں تک مقالہ نگار کے مطالب اپنی زبان میں ادا کر دیے گئے، آگے جو کچھ آ رہا ہے، اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ عبارت بھی حتی الامکان، مقالہ نگار ہی کی قائم رہے۔ ترجمہ، لفظی اب بھی نہ ہو گا، لیکن بہر حال ترجمہ ہو گا:۔

"مسیحی دنیا ایک زمانے میں اپنے اندر جو اندرونی اتحاد، اور بیرونی قوت جاذبہ رکھتی تھی، اس کا صحیح اندازہ، موجودہ اسلامی دنیا سے مقابلہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ (اسلام مسیحیت ہی کی ایک ادنیٰ درجہ کی نقل ہے، اور نشو و نما بھی جس کا بہت دیر میں ہوا) مغربی افریقہ ہو یا ہندوستان، مسیحی مبلغ سے بڑھ کر برابر عملی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغ، نومسلموں کو حقیقۃً اپنے طبقہ میں شامل کر لیتا ہے، معاشرت میں ان سے برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور اپنی لڑکیوں کو انھیں بیاہ دیتا ہے۔ اس کے برعکس یورپی مبلغ، اسی تفریق رنگ کی بنا پر "دیسی" مسیحیوں سے ویسا ہی اجنبی و بیگانہ رہتا ہے، جیسا کہ غیر مسیحی کافروں سے۔ اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک "دیسی" کلیسا کا انتظام کر سکتا ہے، یورپی آبادی سے بالکل خارج ۔"

یہ آخری خط کشیدہ فقرے خدا جانے ڈاکٹر امبدکار اور دوسرے اچھوتوں کی نظر سے بھی کبھی گزرے ہیں، جو اپنی پستی اور ذلت کا احساس کر کے ایک نئے دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یاد رہے کہ ابتدائی غیر خط کشیدہ فقروں کی طرح، یہ عبارت ایک یورپی مسیحی کے قلم سے ہے، جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ دوستی کا نہیں، دشمنی کا ہے۔

اب آگے جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کے خوش ہونے کے لیے نہیں، عبرت و نصیحت حاصل کرنے، اور غور کرنے کے لیے ہے:۔

"البتہ یہ ملحوظ رہے کہ جو مسلمان آبادیاں یورپی تمدن کی سطح کے قریب ترین آگئی ہیں، خود وہ بھی اپنی اسلامی (پان اسلامک) اخوت کو ختم کرتی جاتی ہیں اور یورپین طرز کی وہ قومیت اختیار کرتی جاتی ہیں جس کی بنیاد وحدت لسانی پر ہے۔ چنانچہ شام کے عربوں میں اس جذبۂ قومیت کا حاصل یہ نکلا کہ اُن کے اور ایرانیوں اور ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان مغائرت قائم ہوگئی، اور اس نقصان کی تلافی یوں ہوئی کہ عربی زبان بولنے والے مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان مغائرت کا حجاب اٹھ گیا۔ ادھر عثمانی ترکوں[1] میں جو قومیت نمو پا رہی ہے، وہ خالص افتراقی قسم کی ہے۔ ۱۹۰۸ء کے قبل تک، سلطنت عثمانیہ میں

---

[1] واضح رہے کہ مقالہ مصطفےٰ کمال کے دور سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے مسیحی ممالک کی طرح، برسرِ اقتدار وہ طبقہ تھا، جو اپنے میں بلحاظ حقوق، شمار و شامل اپنے ملک کے ان سارے لوگوں کو کر رہا تھا، جو اس کے ہم مذہب ہوں، خواہ یہ ہم مذہبی ارثاً حاصل ہوئی ہو، یا حال میں بذریعہ تبلیغ۔ نوجوان ترک پارٹی جب برسرِ اقتدار ہوئی، تو اس نے اس اخوتِ اسلامی کے بجائے "عثمانیت" کا پروگرام پیش کیا۔ یعنی اشتراک کی بنیاد بجائے مذہب اسلام کے، ترکی زبان کو قرار دے دیا۔ اور عثمانی حدودِ ملک سے اُن تمام لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا، جن میں عثمانیت نہ طوعاً پیدا ہو سکی، نہ کرہاً۔ جنگ یورپ کے درمیان میں ٹرکی میں جو سلی مقدمات چلے، وہ جس طرح آرمینی مسیحیوں کے خلاف تھے اسی طرح عرب مسلمان کے خلاف بھی۔ اور گو آرمینیوں کو حسبِ دستور قدیم اب بھی اسلام قبول کرنے لگا موقع دیا جاتا رہا۔ لیکن اب اسلام قبول کرنے کے بعد ہونے یہ لگا کہ اگر وہ عورتوں اور بچوں کے محض چند افراد ہوتے تو انہیں ترکی خاندانوں کے حوالے کر دیا جاتا، اور اگر پورے گاؤں یا قصبوں کی آبادیاں ہوتیں، تو ان کے ساتھ بھی، بس اُسی سختی کا برتاؤ رہتا، جس طرح اسلام نہ قبول کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ پوری پوری آبادیاں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی زبان قدیم قائم رکھیں، جیسا کہ بوسینا کے سلافی نسل والے، اپنی علٰحدہ زبان، جب سے پندرھویں صدی میں سب کے سب مسلمان ہو گئے، اب تک رکھتے چلے آئے ہیں۔ وحدتِ دینی جو اشتراک معاشری کی بنیاد آباو اجداد کے وقت سے چلی آتی تھی، اس سے نوجوان ترکوں کو کوئی غرض ہی نہ تھی، جبکہ وہ وحدتِ دینی، اختلافِ ظواہر کو نہ مٹا سکے، جو جدید اور نازک قومی احساس کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد مقالہ نگار آخر میں دو سوالات پیش کرتا ہے:۔

"موجودہ احساسِ قومی کے اس تاریخی ارتقاء کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے زیادہ ترقی پذیر مسلم آبادیوں نے آخر اس قومیت

کا اثر کیوں اتنا زیادہ قبول کر لیا ہے، جو حقیقۃً ایک تنزلی تحریک ہے؟ اور اگر اس کا سبب تقلید یورپ کو قرار دیا جائے، تو پھر یورپ، قرون مظلمہ سے لے کر اب تک کیسے ایسی مسلسل ترقی، اس انحطاط انگیز تحریک کے باوجود کرتا چلا آ رہا ہے"۔

مقالہ نگار نے جواب جو کچھ دیا ہو، اس سے یہاں غرض نہیں۔ سوال تو آپ کے سوچنے کا ہے۔ کیا آپ کے قرآن نے اگر آپ کو یہ پیام نہیں سنا دیا تھا کہ

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ (نساء ع ۱)	اے انسانو! ڈرتے رہو اپنے پروردگار سے جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

اور جس نے پھر اسی حقیقت کو یوں ظاہر کیا تھا کہ

ھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ (انعام ع ۱۲)	وہ پروردگار ہی تو ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کر دیا ایک ہی شخص سے۔

اور پھر اسی پیام کو یوں یاد دلایا۔

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ (اعراف ع ۲۴)	وہ خدا ہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا ایک ہی شخص سے

اور پھر فرمایا

خلقکم من نفس واحدۃ (زمر ع ۱)	پیدا کیا تم (سب) کو ایک ہی جان سے

اور کیا قرآن نے ایک آدھ بار نہیں، دس بیس بار، یا ایھا الناس کا خطاب دوہرا کر یہ حقیقت خوب واضح نہیں کر دی ہے، کہ تمام نوع انسان، اصلاً ایک ہے۔ وحدت انسانی، اساسی و فطری ہے۔ جغرافی، لسانی، نسلی، کوئی ساری تقسیمات محض فرعی و ضمنی ہیں۔ اچھے اور برے، کھرے اور کھوٹے، جو کچھ ہے، وہ عقائد و اعمال کی بنا پر، جو تمامتر اپنے اختیار و ارادے کی چیزیں ہیں، نہ کہ فلاں خاندان میں، فلاں سرزمین پر، فلاں ملک میں، پیدا ہو جانے کی بنا پر، جو انسان کے اندر اپنے ارادہ و اختیار سے تمامتر باہر ہے؟

اسلام کے قبل دنیا تو مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی ہی، حد یہ ہے کہ دیوتا اور خدا تک ہر ہر شہر اور ضلع کے، دوسری جگہ سے الگ تھے۔ یہود جو موحد تھے، ان تک نے باوجود دعوے توحید کے، خدا کی خدائی کو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر لیا تھا، اور رب موسیٰ گویا صرف رب قوم موسیٰ تھا۔ یہ تخیل تو اسلام ہی نے آکر مٹایا۔ اسلام ہی نے "رب العالمین" کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا، سب کو وحدت عقیدہ کی طرف بلایا۔ اور دنیا کی تقسیم صرف دو ہی حصوں میں رکھی۔ پیام کو قبول کرنے والے، اور نہ قبول کرنے والے۔

خدا کا غضب ہے کہ خود مسلمان ہی اس خدائی تفریق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اور اس کی جگہ پھر وہ مشرک قوموں والی، دور جاہلیت والی ذات پات والی، چھوت چھات والی تقسیم قائم کرنا چاہتے ہیں! شاندار ناموں کی آڑ میں بڑے بڑے القاب کو سپر بنا کر، اور یہ بھی، اس وقت جب خود یورپ اپنی نکالی ہوئی راہ سے عاجز آ چلا ہے، اور خود اپنے پیروں سے ان بیڑیوں کو کاٹنا چاہ رہا ہے عملاً اسے اس پر قدرت ہو یا نہ ہو، یہ الگ سوال ہے، باقی اس کے سوچنے والے دماغ سوچ تو اب بھی رہے ہیں۔

خوش نصیب گول کیپر

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد، سنہ غالباً ۱۹۰۷ تھا، اور جاڑوں کا زمانہ، علیگڈھ کی فٹ بال ٹیم، لکھنو، میچ کھیلنے کو آئی ادھر علیگڈھ کے کھلاڑی گیند بلے میں اپنا سکہ جمائے ہوئے، ادھر لکھنو کی خلقت، کھیل تماشے کے شوق میں نام اچھالے ہوئے۔ شہر میں ایک دھوم مچ گئی، میچ کیننگ کالج گراونڈ پر تھا تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر غریب جوان بوڑھے، طالبعلم اور سودے والے سبھی، اور اسی مجمع میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالبعلم بھی، علیگڈھ کے کھلنڈرے ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن تماشائیوں کی نظر میں بس علیگڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں، ایک سرخ و سفید، قوی و تنو مند، خوش رو نوجوان۔ پہاڑ کی طرح اٹل، اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لیے خلق ہوا ہے! لکھنو کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ پھر پھر کر کیسے کیسے حملے کرتی! اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام! بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں! اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علیگڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ "تصدق" کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبہ کے اندر نہیں، سیاسیات و قومیات کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے

ل وعریض رقبہ میں۔ بڑی بڑی زبردست ٹیموں کے مقابلے میں۔ ملک وملت کی
ل کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے'!

سب سے پہلی زیارت۔ یوں ہوئی کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ یہ
لھیل کا مردمیدان' یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا جید مقرر بھی یونین
کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو علیگڈھ سے واقف ہیں۔
ل خوش ہوگیا کہ جو جسم کا دھنی تھا اس کا دماغ بھی کورا نہ نکلا'!... چار پانچ برس
کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے...... اب سنہ ۱۹۱۲ء آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری
عشرہ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے۔ اور پرانے قومی لیڈروں کے قلوب لرزہ ہیں
ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی' ہر قومی ادارہ میں کمریڈ
اور الہلال معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں' آزادی کی تحریک کا بگل
بج چکا ہے" وفاداری حکومت" اور "مطالبہ حقوق" کے درمیان۔ پوری شد ومد کے
ساتھ پہلی بار طاقت آزمائی ہو رہی ہے۔ ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں
یعنی وہ آقا جن کی زبانیں اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں' اور دوسری طرف
باغی' ابوالکلام اور شوریدہ سر محمد علی معہ اپنے چند نوعمر رفیقوں کے' ان گنے چنے چند
رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے زیادہ بلند نظر آ رہا ہے (اور بلحاظ باطن
بھی وہ کس سے کم ہے؟) وہ وہی پرانا گول کیپر ہے۔ تصدق احمد خاں شروانی' علیگڈھ کا
گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر!

آج سے محمد علی جو تحریک اٹھاتے ہیں۔ چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح
کی ہو۔ یا جنگ بلقان کے چندے کی' یا قوم وملت کی آزادی کی' تصدق شروانی'
سب میں سب سے پیش پیش شیر دل جنرل کا ایک شیر دل لفٹنٹ یہاں تک کہ
سنہ ۱۹-۲۰ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت وترک موالات شروع ہوتی ہے جس نے

سارے ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا ڈالا! تصدق اس وقت تک ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے، اور اپنے پیشہ میں نامور۔ گھر کے خوشحال پہلے ہی سے تھے اور اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑو، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کرو۔ جو سر اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے اُن سابق الاوّلون میں ایک یہ بھی تھے۔ غالباً ۲۲ء تھا کہ علیگڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا، شروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقعہ ہاتھ لگا دھر پکڑے گئے، اُلٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا گئے تھے آگ بجھانے مجرم آگ کے قرار پائے، اور وہ جس کا کام قصورواروں کا چھڑانا اور خطا کاروں کو رہائی دلانا تھا، اب خود بجرم و بے خطا، قید فرنگ میں اسیر و محبوس تھا! سادی قید اور پھر قید سخت، غالباً کچھ روز کے لیے قید تنہائی بھی۔ ایک رئیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی! بڑی تکلیفوں کو چھوڑیے، تنگ و تاریک کوٹھری میں مچھروں ہی نے ایسا بھنبھوڑا کہ بے حال ہو گئے، اور بیمار بنکر نکلے! ماں باپ نے نام تصدیق رکھا تھا۔ کیا یہ نام ہی نام رہتا؟ اور عزت کی، آرام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے، آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی تھی جو یے کر آئے تھے، لیکن بہرحال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب ہی الٹ پھیر میں گذاری! ابھی دیکھیے تو علیگڈھ میں ضلع کی عدالتوں میں ہیں الہ آباد میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور ایڈوکیٹ ہیں۔ اور دوسروں کی بگڑی ہوئی بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے مشیر اور جواہر لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگریس کو اپنے اشاروں پر چلا رہے ہیں۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ لق و دق کوٹھی ہجی سجائی موٹر کار نفیس مسہری اور دلکشا پائیں باغ سب چھوڑ چھاڑ اور اٹھائی گیروں کی

ہیں میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے نقب زنوں اور گرہ کٹوں کی قطار میں بیٹھی گدڑی اوڑھے لپیٹے جیل کی کھردری زمین پر پڑے ہوئے ہیں بلند ہو اقبال سرکار نامدار کا! جوہر شناسی اسے کہتے ہیں! قدردانی اس کا نام ہے' ہندوستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق نکتہ نواز' قدرشناس حکومت سے واسطہ پڑا ہوگا!

مرنے والا مرچکا۔ جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزار ہا روپے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائیکورٹ کا جج۔ کوئی ہزاروں کما رہا تھا، کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا۔ کوئی صوبہ کا منسٹر کوئی ایگزیکیٹو کونسلر، کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یوں ہی ساری عمر تیر کردینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی لوہے کا ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کی بیوی بچے' دوست' عزیز بھائی بند نہ تھے کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے بسنے دنیا کا جشن کرنے زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ تکلیف اس کے لیے تکلیف اور راحت اس کے لیے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہوسکے تو سوچنے والے سوچیں!

محمد علی جیل جاکر شاعر ہو جاتے تھے۔ سنہ ۲۱ تا سنہ ۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک پشتارہ ساتھ لیے ہوئے شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاعری میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے جیل جانے سے قبل مسلم یونیورسٹی

کے معاملات میں شروانی خاندان کے اکابر سے بہت کچھ رنج اٹھا چکے تھے۔
رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے ایک بڑی سی غزل
اس زمین میں سنائی "بیابانیوں میں ہم" "پریشانیوں میں" ہم ایک مشہور "وفادار"
بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا۔

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی
گڈنی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم

(اکرم گڈنی نے مسلمانوں کے "جیش انگورہ" کے مقابلے میں "جیش یونان"
کی تحریک کی تھی) اور تو اور بڑے بھیا تک کو نہیں چھوڑا تھا۔

شوکت یہ کہتے ہیں رہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم!

(خبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راجکوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہوگئے ہیں)
ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "مصدق" کی زبان سے کہا ہے اُسے ضرور سنو۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم!

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے،
یوں تو جب تک دوستی و یک دلی ہے سبھی اچھے نظر آتے ہیں محمد علیؒ سے شروانی کا
سیاسی اختلاف ۲۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ روز بروز بڑھتا گیا۔ ادھر آغاز
الٹ پھیر میں گذاری؛ ابھی دہالیت اس درجہ ابتر ہو کر رہی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر
میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور اعجم کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہو گی مولانا
ہوئے بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے مشیر اور جوڑ جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے،
کو اپنے اشاروں پر چلا رہے ہیں۔ ادھر یہ نام پیش ہوئے، محبت و عقیدت کے دم
موٹر کار نفیس مسہری اور روپیہ جیسے بزرگوار نکل گئے شروانی کے عزیز ترین دوست

ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا میں کہتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن الہ آباد میں ایک بار جب جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا، کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں! خیر وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی (زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغناء کی بنا پر) لیکن شروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے، خوبیاں بہت تھیں بہت تھیں اس محبت و اخلاص! اس ہمت و مردانگی! اس اخلاص و فراخدلی اس ذوقِ خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کمتر دیکھنے میں آئی ہیں ـــــ جمعہ کے دن کی موت، عین نماز فجر کے وقت۔ ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے، اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں! خوش نصیب گول کیپر! دنیا اور آخرت، دونوں جگہ بازی لے گیا!

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

کی

نئی تصنیفات

رئیس الاحرار محمد علیؒ کے حالات زندگی

محمد علی کی زندگی کے حالات دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال و استقبال کی تفسیر ہے۔ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا۔ اور نمایندہ بھی۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیئے قیمت دو روپیہ بارہ آنہ۔

مُردوں کی مسیحائی۔ ازمولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ جو سیرت طیبہ سے متعلق ہیں۔ پختہ ادیب کا قلم اور سیرت طیبہ کا موضوع۔ اس میں آپ وہ پائیں گے جو سیرت طیبہ کی ضخیم ضخیم کتابوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ ادب، انشاء، رموز، نکات اور سبق، نادر و بیش بہا مجموعہ۔ قیمت صرف تین روپیہ چار آنہ۔

یقین وعمل۔ ازعبدالقدوس ہاشمی، دنیا کی موجودہ بے چینی کا حل۔ صدر جمعیت فلاسفہ لندن کے افکار و خیالات۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔

ادارہ اشاعت اردو

عابد روڈ۔ حیدر آباد (دکن)